اترپردیش اردو اکادمی
उत्तर प्रदेश उर्दू अकादमी

سہ ماہی

اکادمی

اپریل-جون ۲۰۲۵

اُترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

اترپردیش اردو اکادمی

سہ ماہی

اکادمی مجلّہ

جلد نمبر ۲۲　　اپریل - جون ۲۰۲۵　　شمارہ نمبر ۴

ایڈیٹر : شوکت علی (سکریٹری)

معاون : ممتاز احمد (سپرنٹنڈنٹ)

رسالے کے مندرجات سے اترپردیش اردو اکادمی کا بہر صورت متفق ہونا ضروری نہیں

زرسالانہ: پچاس روپے-/50　　قیمت فی شارہ : پندرہ روپے-/15

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

سکریٹری، اترپردیش اردو اکادمی

وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ۔226010، فون نمبر 0522-4022924

upurduakademi3@gmail.com

www.upurduakademi.in

شوکت علی، سکریٹری، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے میسرس اے۔ ایس انٹرپرائزز، نبی نگر چکدادن پور، کاکوری، لکھنؤ سے چھپوا کر اکادمی کے دفتر واقع وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ-226010 سے شائع کیا۔

ترتیب

اداریہ	ایڈیٹر	۳
نواب سید محمد آزاد- حیات وفن ڈاکٹر سید صابر حسن		۵
مرزا عباس بیگ محشرؔ بنارسی وسیم حیدر ہاشمی		۱۹
نورالحسنین کی افسانہ نگاری کا تنقیدی تجزیہ ابراہیم اعظمی		۳۲
اعظم کُریوی: حیات اور شخصیت ڈاکٹر جہاں گیر حسن		۴۵

❖❖❖

اداریہ

اردو زبان و ادب کی آبیاری میں جن قلمکاروں نے اپنی خدمات انجام دی ہیں انھیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ حقیقت ہے کہ کچھ قلمکاروں پر بہت کچھ لکھا گیا۔ آج بھی تحقیقات ہو رہی ہیں لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ بعض بلند قامت شخصیات پر یا تو کچھ لکھا ہی نہیں گیا یا بہت کم کام ہوا ہے۔ یونیورسٹیوں میں بھی انھیں شخصیات یا اصناف پر تحقیق ہو رہی ہے جن پر بہت کچھ تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ کاش یونیورسٹیز کے شعبہ اردو سے متعلق اساتذہ ان ادیبوں اور شعراء پر ریسرچ کراتے جن کی خدمات کو ایک طریقہ سے فراموش کر دیا گیا ہے۔ امید ہے کہ میری اس گزارش پر اہل قلم حضرات غور و فکر کریں گے۔ اتر پردیش اردو اکادمی اپنے رسائل ماہنامہ خبرنامہ، سہ ماہی اکادمی اور باغیچہ میں اس بات کا خیال رکھتی ہے کہ ایسے ادیبوں اور قلمکاروں سے متعلق مضامین اور ان کی خدمات کا اعتراف کیا جائے۔ ساتھ ہی نئے قلمکاروں کو بھی جگہ دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی رسالے کو شائع کرنے کے پیچھے اس ادارہ کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ اکادمی اپنے فرائض کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ اس لئے قلمکاروں سے گزارش ہے کہ خاص طور سے سہ ماہی اکادمی میں ایسے تحقیقی و تنقیدی مضامین ارسال کرنے کی کوشش کی جائے جس سے نئی نسل کی معلومات میں اضافہ ہو سکے اور ان ادیبوں کی خدمات کا پتہ لگ سکے۔

اس شمارے میں اس بات کا خیال کیا گیا ہے اور ان شخصیات پر مضامین شامل کئے گئے ہیں جنھوں نے اردو کی ترقی و ترویج میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ اکادمی کی فہرست دیکھنے کے بعد آپ کو خود اس بات کا احساس ہوگا کہ ان شخصیات پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ مشمولات میں پہلا مضمون ڈاکٹر سید صابر حسن صاحب کا ہے جنھوں نے 'نواب سید محمد آزاد: حیات و فن' پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ سید محمد آزاد کی کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ 'خیالات آزاد'

'سوانح عمری آزاد' 'نوابی دربار' وغیرہ۔ سہ ماہی اکادمی کے اس شمارہ میں ان پر شائع مضمون کا مطالعہ کرنے پر قارئین کی معلومات میں مزید اضافہ ہوگا۔ ایسا میرا اپنا خیال ہے۔

دوسرا مضمون وسیم حیدر ہاشمی صاحب کا ہے جس کا عنوان مرزا عباس بیگ محشر بنارسی ہے۔ یہ محشر بنارسی کی حیات اور کارناموں پر ایک تحقیقی مضمون ہے۔ پروفیسر عشرت صاحب کی یادداشت کے سہارے اس مضمون میں بڑی اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ان کی زندگی کے نشیب وفراز کی عکاسی ان کی شاعری میں ہے۔

تیسرا مضمون نورالحسنین کی افسانہ نگاری پر ابراہیم اعظمی صاحب نے تحریر کیا ہے۔ نورالحسنین کا نام محتاج تعارف نہیں۔ فکشن کی تاریخ میں ان کا نام بڑے افسانہ نگاروں میں گردانا جاتا ہے۔ مضمون نگار نے ان کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ لینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

چوتھا مضمون 'اعظم کُریوی: حیات اور شخصیت' پر لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر جہانگیر حسن نے اس شخصیت کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور اعظم کُریوی کی حیات سے متعلق بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ خاندانی نسب نامہ، عہد طفولیت اور پرورش، حصول تعلیم، عہد ملازمت، وفات، شخص وعکس ادبی خدمات، حب الوطنی تحریکات آزادی سے وابستگی جیسے گوشوں پر اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ اس مضمون میں آپ کو پڑھنے کو ملے گا کہ کس طرح ایک بچہ جس کا بچپن ناز ونعم میں گزرا لیکن جیسے جیسے وہ باشعور ہوتا گیا وہ اتنا ہی بااصول ہوتا گیا۔ اس کے دل میں وطن کی ایسی محبت پیدا ہوئی کہ انگریزوں کی نوکری میں رہتے ہوئے بھی کبھی ان کو عزت نہ دے سکا جس کا اسے خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔ تمام پریشانیوں سے دوچار ہونے کے باوجود کبھی اس کا حوصلہ پست نہیں ہوا اور نامساعد حالت میں بھی وہ ادب کی خدمت کرتا رہا۔

مجھے امید ہے کہ قارئین اس شمارے کے مضامین سے مستفید ہوں گے۔

شوکت علی

ایڈیٹر

ڈاکٹر سید صابر حسن
نئی دہلی

نواب سید محمد آزاد - حیات وفن

نواب سید محمد آزاد کی پیدائش ۱۸۴۶ء میں ڈھاکہ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم والد کی سرپرستی میں انجام کو پہنچی۔ اردو، فاسی کی تعلیم آغا احمد علی اصفہانی مصنف مؤید برہان کے زیر نگرانی مکمل کی۔ ذہنی تیزی وذکاوت کے طفیل مشرقی علوم میں مہارت حاصل کی۔ انگریزی تعلیم اپنے خسر محترم نواب سید عبداللطیف کی صحبت میں مکمل کی۔ نواب سید محمد آزاد ایک قدیم جاگیردار خاندان کے چشم وچراغ تھے۔ آپ کے جدامجد ایران سے ہندوستان تشریف لائے اور الہ آباد میں بودوباش اختیار کی۔ آزاد کے مورث اعلیٰ میر اشرف علی پھول پور الہ آباد سے ڈھاکہ گئے اور وہیں مستقل سکونت پذیر ہوئے۔ اپنی جودت طبع اور عقل وفہم کے سبب انگریزوں کی سرپرستی سے فیضیاب ہوئے اور ڈھاکہ میں پروقار لوگوں میں اپنی جگہ بنائی۔

نواب سید محمد آزاد کے دادا خان بہادر سید علی مہدی تھے اور ان کے والد کا نام اسدالدین حیدر تھا۔ ان کی شادی نواب النساء بیگم سے ہوئی۔ ان کے تعلق سے اسدالدین کے تین بیٹے ہوئے۔ بڑے سید عبدالعزیز، منجھلے سید محمود اور چھوٹے سید محمد تھے۔ سید محمد بہت سلیقہ شعار اور خوب رو تھے۔ بنگال میں فارسی کے مشہور شعراء میں وہ اہم مقام رکھتے ہیں۔ وہ اپنے نام کے ساتھ آزاد تخلص کا استعمال کرتے تھے۔ ان کے فارسی و اردو اشعار کا مجموعہ موسوم بہ ''دیوان آزاد'' ۱۸۸۷ء میں شائع ہوا۔ پہلے حصہ میں فارسی کے اشعار اور دوسرے حصہ میں اردو کے اشعار ان کی تصنیف کی زینت بنے ہیں۔ عبدالغفور شہباز نے فارسی زبان میں آزاد کی شاعری کا خوبصورت جائزہ سپرد قلم کیا ہے۔ چند دلچسپ اشعار توجہ طلب ہیں:

دیکھتے دیکھتے ایک خون کا دریا نکلا
چشمۂ چشم کو کیا سمجھے تھے اور کیا نکلا
دم تاثیر سے واں رنج کا حیلہ نکلا
مصرع آہ سے مضمون یہ اچھا نکلا
وہ شب وعدہ رہے غیر کے گھر لطف یہ ہے
ہم پشیماں ہوئے عذر اونکا جو بیجا نکلا
دے کے الزام انھیں خود ہوں میں شرمندہ کہ وہاں
ایک چپ رہنے سے سو وعدوں کا ایفا نکلا
جانتے تھے اسے استاد قصیدہ ہی کا ہم
پر غزل سنج بھی آزاد غضب کا نکلا

سید محمد آزاد کی چار شادیاں ہوئیں۔ دو شادیاں ناکام رہیں۔ تیسری شادی بنگال کی مشہور شخصیت نواب عبداللطیف کی صاحبزادی سے انجام پائی۔ ڈھاکہ میں نواب سید محمد آزاد شادی کی ناکامی کے سبب ذہنی انتشار کے شکار تھے۔ اس لئے ان کے والد نے ان کا غم غلط کرنے کے لئے نواب موصوف کی خدمت میں کلکتہ بھیج دیا۔ یہاں نواب سید محمد آزاد کو نواب عبداللطیف کی صحبت میں سکون قلب وجگر نصب ہوا۔ نواب عبداللطیف اردو شعروادب کی نامور شخصیت عبدالغفور نسّاح کے بڑے بھائی تھے۔ اس تیسری شادی سے اللہ نے انھیں دو اولاد نرینہ سے نوازا۔ یہ دنوں سید علی اشرف اور سید علی مہدی تھے، جو کہ اپنے زمانہ میں اونچے عہدوں پر فائز ہوئے۔ نواب سید محمد آزاد کی تیسری بیگم چند سالوں کے بعد رخصت ہوگئیں۔ اس حادثہ عظیم نے بھی نواب سید محمد آزاد کو بے حد متاثر کیا، لیکن آزاد پھر چوتھی دفعہ نواب عبداللطیف کی منجھلی صاحبزادی سے رشتہ ازدواج سے منسلک ہوئے۔ ان سے آزاد کی پانچ اولادیں عالم وجود میں آئیں۔ نواب سید محمد آزاد ۱۸۷۳ء میں اسپیشل سب رجسٹرار کے عہدہ پر فائزہ ہوئے، پھر ترقی کرتے کرتے مجسٹریٹ بنے۔ دونوں عہدوں کی ذمہ داریوں کو انھوں نے بحسن وخوبی انجام دیا۔ پھر ڈپٹی کلکٹر بنے اور ۲۸ جنوری ۱۹۰۷ء کو وہ انسپکٹر جنرل آف

رجسٹریشن بنگال، بہار اور اڑیسہ کے عہدہ جلیلہ پر فائز کئے گئے۔ پانچ برسوں تک اپنے عہدہ کے فرائض کو نہایت سلیقہ کے ساتھ انجام دینے کے بعد ۱۹۱۲ء میں سرکاری ملازمین سے سبکدوش ہوئے۔ انھوں نے اپنی ملازمت کی ذمہ داریوں کو اس حسن و خوبی سے انجام دیا کہ ۳۹ سالہ لمبی ملازمت کے دوران انگریز افسران کے سامنے ان کی چھوٹی سی بھی کوتاہی نہیں آئی۔

آزاد مشرقی و مغربی علوم کے جامع تھے۔ حسن صورت و حسن سیرت سے اللہ نے بھرپور نوازا تھا۔ ان کی فطرت میں ظرافت کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ان کی اعلیٰ درجہ کی علمی صلاحیت اور کامیاب تنظیمی معاملات اور عہدہ جلیلہ کے فرائض منصبی کو بحسن و خوبی انجام دینے کے سبب برطانوی حکومت نے انھیں ۲۴ جون ۱۹۰۲ء کو خان بہادر اور یکم جنوری ۱۹۰۹ء کو نواب کے خطاب سے نوازا۔

آزاد تقریر بڑی مسحور کن کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی مضمون نویسی کا آغاز فارسی زبان سے کیا۔ ان کی اولین تحریر 'دوربین' کلکتہ میگزین میں چھپی۔ سرکاری ملازمت سے وابستہ رہتے ہوئے انھوں نے انگریزی تہذیب پر بڑی گہری تنقید کی ہے۔ اپنی سرکاری ملازمت کے فرائض کو انجام دیتے ہوئے انگریزی معاشرت پر تنقید کی نظر ڈالنا اور اس کی کمزوریوں کی نشاندہی کرنا بڑا مشکل امر تھا۔ کیونکہ اظہار خیال کی آزادی قابل گرفت ہوسکتی تھی۔ چنانچہ آزاد نے اپنے عقل و شعور سے کام لیتے ہوئے ملک کے مختلف اخبارات میں اپنے طنزیہ مضامین مختلف فرضی ناموں سے شائع کروائے۔ قلمی ناموں کی فہرست اس طرح ہے:

۱-مولانا آزاد ۲- آزاد ۳-کوئی نہیں ۴-نئی روشنی کا ہستی سوز چراغ ۵-سعید ازلی ۶- تیغ بے نیام ۷-لیڈی خروس ۸- رپورٹر اودھ پنچ ۹-محمد بصیر اللہ خاں ۱۰-ایک اسّی سالہ مجرد ۱۱-تمدنی سوئیپر ۱۲-صوفیہ ۱۳-خاص رپورٹر اودھ پنچ ۱۴-تہذیب امروز بیگم ۱۵-شہاب ثاقب۔

سید محمد آزاد اودھ پنچ لکھنؤ کے خاص نامہ نگاروں میں سے تھے۔ جب منشی سجاد حسین نے ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے اودھ پنچ جاری کیا تو نواب آزاد اس میں اپنے مضامین تواتر سے شائع کراتے رہے۔ اودھ پنچ میں ان کے مضامین اس قدر مستعدی کے ساتھ شائع ہوئے کہ انھیں

ہندوستان گیر شہرت نصیب ہوئی۔ ان کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین ان کے وسیع تجربوں اور تبحر علمی کے سبب اعلیٰ ادبی مقام کے حامل تھے جس کی وجہ سے ان کو مقبولیت عام اور شہرت دوام حاصل ہوئی۔ کلکتہ سے ایک انگریزی اخبار ''رئیس اینڈ رعیت'' شمبھو چندڈے کی ایڈیٹری میں نکلتا تھا۔ اس میں آزاد کے مضامین بہت دلچسپ اور علمی ہوا کرتے تھے۔ لوگ اس زمانہ میں اسے بہت ذوق وشوق سے پڑھتے تھے۔ اس اخبار میں ''دی ملاقات'' کے عنوان سے آزاد کے طنزیہ مزاحیہ مضامین شائع ہونے لگے جس سے ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔

نواب سید آزاد کی اکثر و بیشتر تحریریں اودھ پنچ لکھنؤ میں چھپتی رہیں۔ آزاد کا زبان ادب سے گہرا تعلق تھا اور طرز بیان اور لب ولہجہ طنزیہ مزاحیہ رنگ سے معمور ہوتا تھا جو قاری کے دل و دماغ پر اپنی ایک انمٹ چھاپ چھوڑ جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نواب آزاد کی تحریروں کو شہرت ملی۔ ان کی تحریریں صاف، شستہ اور رواں ہیں۔ وہ عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ کے استعمال سے اجتناب کرتے ہیں اور اس میں ہلکے ہلکے طنز ومزاح کی چاشنی ملا کر اسے جاذب نظر اور دل پذیر بنا دیتے ہیں۔ چونکہ وہ ایک علیٰ سرکاری عہدہ پر فائز تھے اور انگریزی حکومت برسر اقتدار تھی، ایسے وقت میں انگریزی تہذیب کی کمزوریوں کا تذکرہ اپنی تحریروں میں ان کے لئے بڑی آزمائشوں کا معاملہ تھا مگر آزاد نے اپنی طنزیہ ومزاحیہ تحریروں کو بڑے سلیقے اور نہایت چابکدستی اور اعلیٰ درجہ کی فہم وفراست کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی تحریروں کو منظر عام پر پیش کیا اور حکومت کی بندشوں اور گرفت سے محفوظ رہے۔ وہ اس حقیقت کا اعتراف خود کرتے ہیں:

> **”نواب آزاد ۳۹ سالہ طویل سرکاری ملازمت میں انگریز حکومت کی گرفت سے محفوظ رہے اور ان کا کیریئر بے داغ رہا۔ اردو نثر کے باغ میں آزاد نے بڑے خوشنما انواع و اقسام کے پھول کھلائے جس سے گلستان ادب ہنوز معطر ہے۔“**

''میرے مضامین قانون کے فلٹر میں چھنے ہوئے ہیں'' (شہاب ثاقب از اختر حسن نبیرۂ آزاد ماہ نو کراچی، اپریل ۱۹۶۱ء، صفحہ ۴۲)

یہی وجہ تھی کہ نواب آزاد ۳۹ سالہ طویل سرکاری ملازمت میں انگریز حکومت کی گرفت سے محفوظ رہے اور ان کا کیریئر بے داغ رہا۔ اردو نثر کے باغ میں آزاد نے بڑے خوشنما انواع واقسام کے پھول کھلائے جس سے گلستان ادب ہنوز معطر ہے۔ وہ اپنے عہد کے کامیاب اور مایہ ناز نثر نگار تھے۔ ان کے اکثر مضامین طنز و مزاح سے وابستہ ہوتے اور اودھ پنچ لکھنؤ کے اوراق کی زینت بنتے تھے۔ آزاد نے اس صنف ادب پر اپنے تبحر علمی کا بڑا کامیاب اور بے مثال مظاہرہ کیا۔ وہ اپنی اسی خاص ادا کے سبب اپنے ہم عصروں میں خاصے مقبول ہوئے اور اب تک ان کی تحریریں تازہ و شاداب ہیں۔ زبان و بیان پر انھیں بڑی قدرت حاصل ہے۔ وہ بڑی حساس طبیعت کے مالک تھے۔ قدرت نے انھیں ایک شاعر کا دل اور ناقد کا ذہن بخشا تھا۔ بقول سید اختر حسن نبیرۂ آزاد:

> ''اپنے اخ معظم سید محمود آزاد کی صحبت بابرکت میں فن شاعری و عروض و قوافی میں کامل استعداد حاصل کی تھی'' (شہاب ثاقب از سید اختر حسن مطبوعہ ماہ نو کراچی، اپریل ۱۹۶۱ء، صفحہ ۴۱)

'شہاب ثاقب' کے فرضی نام اور لیڈر نامہ کے عنوان سے انھوں نے ایک شاندار نظم منظر عام پر پیش کی تھی۔ چوالیس اشعار کی یہ طویل نظم قاضی ابوالمظفر مولا بخش المتخلص بہ رضوان صاحب کے رضوانی پریس کلکتہ سے چھپی تھی۔ اس نظم کے مطالعہ سے آزاد کی شعری حیثیت مستحکم ہو جاتی ہے۔ اس نظم کے شائع ہوتے ہی ریاکار لیڈر پریشان ہو اٹھے کیونکہ یہ نظم ان کی بداعمالیوں کی منہ بولتی تصویر پیش کرتی ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے نظم لیڈر نامہ کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں:

عجب جادو اثر ہے دل ربا ہے نام لیڈر کا
بہت دلچسپ اور عقدہ کشا ہے کام لیڈر کا
گلے میں ہار ہے پھولوں کے گلدستے ہیں ہاتھوں میں
یہ اعزاز و نشاں پبلک میں ہے خوشنام لیڈر کا
ہزاروں کے سروں کو دم کے دم میں مونڈ ڈالا ہے

ہے قومی باربر قومی لقب خود کام لیڈر کا
کیا کرتا ہے وہ ہذیاں سرائی نام لیکچر ہے
بہت ایذا رساں ہے بانگ بے ہنگام لیڈر کا
کبھی غیبت بھی سازش کبھی فتنہ کبھی چغلی
یہی ہے مفسدانہ شغل نافرجام لیڈر کا
ہوس سے لیڈری کے کون سا سر آج خالی ہے
میاں جمن بھی کرنا چاہتے ہیں کام لیڈر کا
ڈینر اور لنچ کھا کھا کر بنی بگڑی ہوئی صحت
بحمد اللہ کہ چہرہ ہوگیا گلفام لیڈر کا
ہوئی ہیں جلوہ افگن بیگماتیں جب سے پبلک میں
پری زادوں کا گلدستہ بنا ہے بام لیڈر کا
حکومت اور رعایا میں یہ ثالث بن کر بیٹھا ہے
الٰہی خیر ہو مشکل بہت ہے کام لیڈر کا
کبھی کونسل میں لڑتا ہے کبھی پولیس سے بھڑتا ہے
کبھی شامت سے ہوتا جیل ہے انجام لیڈر کا
ہوا اچھا تصرف مصرع استاد میں ثاقبؔ
بہ از لیڈر جہاں میں ہے عزیزو! نام لیڈر کا

آزاد میں تنقیدی شعور بھی بڑا بالیدہ تھا۔ انھوں نے عبدالغفور شہباز کے مجموعہ رباعیات موسوم بہ ''رباعیات شہباز'' پر بڑا عالمانہ تبصرہ کیا جس سے ان کی تنقیدی صلاحیت ظاہر ہے:

''اردو کے ابتدائے زمانہ میں چونکہ عربی کے سوا اور اصناف کلام کی طرف کم توجہ کی گئی ہے اس لئے پہلے طبقے کے اساتذہ کے کلام میں کوئی قابل التفات اور لائق نازش سرمایہ رباعیوں کا نظر نہیں آتا ہے۔ البتہ میر درد، میر تقی میر، سودا اور بعد ان کے ذوق وغیرہ نے رباعی کی طرف کسی قدر ممتاز

التفات بہ نسبت اپنے مقدمین کے کیا ہے اور اس میں ان کو کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی یہ امر کسی قدر مشکوک ہے۔ ہاں ذوق کی بعض رباعیوں سے ایک مزہ دار اور پر اثر طرز خاص جھلکتی ہے جس سے اس کا سارا کلام بھرا ہوا ہے۔ بعد اس کے لکھنؤ کے صاحب کمال رزم بزم کے مالک مرثیہ گو شاعروں نے پھر رباعی پر اپنے رنگ میں خوب زور لگایا اور بہت کچھ دادِ سخن گستری و بلاغت وفصاحت دی ہے۔ان کی اکثر رباعیاں مذہبی خیالات، حمد ونعت اور زیادہ تر منقبت کے مضامینِ فیض آگیں سے آراستہ ہیں''۔

نواب آزاد کی نثر بڑی دلکش اور شگفتہ ہے۔انھوں نے اپنی نثر کے کئی مجموعے منظرعام پر پیش کیئے۔ ان کے طرز بیان اور طرز ادا میں بڑی دل پذیری اور دلکشی ہے۔ان کی نثر کا یہ بانکپن ان کے وسیع تجربوں اور اعلیٰ درجہ کی علمی صلاحیتوں کی غمازی کرتا ہے۔ان کی نثر نگاری غیر معیاری رنگ سے پاک ہے اس لئے قاری کے دل و دماغ کو محظوظ کرتی ہے۔وہ حد ادب سے کبھی تجاوز نہیں کرتے۔ان کے جملے بڑے چست اور سلجھے ہوئے ہوتے ہیں جو کہ ذہن قاری پر بوجھ نہیں بنتے۔

اودھ پنچ لکھنؤ میں نواب سید محمد آزاد کے مضامین باقاعدگی سے چھپتے رہے۔سجاد حسین نے اودھ پنچ کو اپنے زمانے کا ایک مقبول پرچہ بنایا۔اس میں مضمون نگاری کرنے والوں کی اچھی تعداد تھی۔یہی وجہ تھی کہ سجاد حسین تقریباً چھتیس برس تک اس اخبار کے ذریعہ ملک وقوم کی خدمت میں نہایت خلوص ومحبت کے ساتھ مصروف رہے۔ادیبوں کے بعض مضامین سے دلآزادی بھی ہوتی تھی اور لوگوں میں اشتعال بھی پیدا ہوتا تھا اس کے باوجود اودھ پنچ نے اردو نثر کے میدان میں طنز وظرافت کے جو خوشنما وشاداب گلشن کی آبیاری کی اس سے اردو ادب کا معیار ومرتبہ بلند ہوا۔

اودھ پنچ کے ابتدائی زمانہ میں طنز وظرافت کے میدان میں سجاد حسین، مچھو بیگ، تربھون لال ہجر، جوالا پرساد برق، احمد علی شوق نے اپنی ادبی کارگزاریوں کے خوب نمونے پیش کیئے۔ اس کی بڑی پذیرائی بھی ہوئی مگر ان فنکاروں کی محفل میں نواب سید محمد آزاد کی انفرادی و

امتیازی شان برقرار رہی۔ ان کی تحریروں میں جو وزن و وقار ہے وہ انھیں طنزیہ و مزاحیہ ادب میں باعث افتخار بناتا ہے۔ نواب آرزو نے لندن سے جو فرضی خطوط لکھے ہیں ان میں مغربی تہذیب پر سخت تنقید ہے اور اپنی تہذیب کی کمزوریوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ ان کی تحریوں میں تلخی اور دلآزادی بہت کم ملتی ہے اور کہیں اگر اس قسم کی باتوں کا ذکر ملتا ہے تو معاشرہ کے تکلیف دہ حالات سے وہ پریشان ہوئے ہیں اور سخت کلامی اور زہرنا کی ان کی تحریروں میں پیدا ہوگئی ہے جس کا کہیں کہیں ان کی تحریروں میں ذکر ہوا ہے۔

"آزاد تقریر بڑی مسحور کن کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی مضمون نویسی کا آغاز فارسی زبان سے کیا۔ ان کی اولین تحریر 'دور بین' کلکتہ میگزین میں چھپی۔ سرکاری ملازمت سے وابستہ رہتے ہوئے انھوں نے انگریزی تہذیب پر بڑی گہری تنقید کی ہے۔ اپنی سرکاری ملازمت کے فرائض کو انجام دیتے ہوئے انگریزی معاشرت پر تنقید کی نظر ڈالنا اور اس کی کمزوریوں کی نشاندہی کرنا بڑا مشکل امر تھا۔ کیونکہ اظہار خیال کی آزادی قابل گرفت ہو سکتی تھی۔ چنانچہ آزاد نے اپنے عقل و شعور سے کام لیتے ہوئے ملک کے مختلف اخبارات میں اپنے طنزیہ مضامین مختلف فرضی ناموں سے شائع کروائے۔"

نواب آرزو کی تحریروں میں جو حسن و دلکشی ہے وہ انھیں طنز و مزاح کی تاریخ میں ایک اعلیٰ مقام پر فائز کرتی ہے۔ وہ ایک صاحب طرز انشاپرداز ہیں۔ ان کی تحریروں میں علم اور فکر و فن کی بڑی خوبصورت آمیزش محسوس کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے بڑی بیباکی، جرأت مندی اور سلیقہ شعاری کے ساتھ مشرقی و مغربی معاشرت کی کمزوریوں کی نشاندہی کی ہے تاکہ سماج کا باشعور طبقہ بشری کمزوریوں کی اصلاح کی فکر کرے۔

نواب آزاد کے حسین اور قیمتی خیالات سے محظوظ ہونے اور ان کی ادبی قدر و قیمت کا پتہ چلانے کے لئے ان کے ادبی شہ پاروں کا مطالعہ ضروری ہے۔ نواب آزاد اپنی عفت بیگم کو لندن

سوومنٹس اسٹریٹ تاریخ ۳۰ جولائی ۱۹۷۸ء سے ایک خط میں نئی روشنی کی تلقین فرماتے ہیں:

''میں تو یہاں پڑھنے آیا ہوں مگر کیا خاک کتاب دیکھوں کوئی آن، کوئی وقت، کوئی لحظہ بھی تو آئینہ خیال کسی پری وش کے جلوے سے خالی نہیں رہتا۔ جب کسی فرنگی کی واٹر سلک کی گون پر آنکھ پڑ جاتی ہے مجھے تمھارا اگرنٹ کا پائجامہ کس شدت سے یاد آتا ہے۔ جب کسی میم کو دوسرے صاحب کے ساتھ بے تکلفانہ ناچتے کودتے دیکھتا ہوں تو تمھاری شرم ایک تیر کی طرح دل کے پار ہوجاتی ہے۔ یہاں کی عورتیں واللہ عورتیں نہیں ہیں، تمھارے لکھنؤ کی بیگمیں نہیں ہیں کہ بھوت کا قصہ سن کر ڈریں، شیر کے نام سے کانپ جائیں، توپ کی آواز سے تھرتھرانے لگیں، ایک چپاتی کھانے پر غرور کریں، حضرت عباس کی درگاہ تک جانے کو حج کا سفر جانیں، حورانِ انگلستان ایک دم میں پرانے بھوت سر سے اتار دیں، شیروں کے شکار کا تماشا دیکھنے جاتی ہیں، موقع ومحل سے ہاتھی پر بیٹھ کر گولی بھی لگاتی ہیں، سیر کرنے روم اور جزائر اور سوئٹزرلینڈ کے پہاڑوں پر مرد احباب کے ساتھ بلکہ اکثر اوقات تنہا بھی چلی جاتی ہیں۔ اپنے شوہروں کو وطن میں چھوڑ کر عجائبات روزگار دیکھنے دور دراز ملکوں میں چلی جاتی ہیں اور اپنے تجربہ کو پختہ کرتی ہیں۔ بڑے بڑے لال کلّے اور سفید کلّے والے سفیروں سے ڈٹ کر ہاتھ ملاتی ہیں۔ کسی کے مرجانے پر برسوں لباس سیاہ پہن کر پیٹی کھاتی اور ناچتی گاتی اور اس کی روح کی دعوت میں مصروف رہتی ہیں۔ عمر بھر پارسا بن کر گرجوں میں پادری صاحب کے ہاتھوں پر صبح وشام توبہ کرتی ہیں۔ اگر میں تم کو ساتھ لاتا تو سارا لندن تمھارا تماشا دیکھتا۔ بیسیوں لارڈ و ڈیوک مجھ سے ملنے آتے۔ میرا کام مفت میں نکلتا۔ یہاں عورتوں کی سفارش ہر قسم کی سفارش سے زور آور اور پُر اثر ہے۔ ان کی سفارش سے بڑے بڑے جلسوں کا ممبر بنتا ہے۔ ان کی سفارش سے عہدہ ہائے جلیلہ ملتے ہیں۔ ان کے ذریعہ اعلیٰ

درجوں کی صحبتوں میں رسائی ہوتی ہے۔ان کی سفارش سے وزارتی حکمت عملی میں فرق آجاتا ہے۔ان کے دباؤ سے بڑے بڑے مدبر اپنی رائے بدل ڈالتے ہیں۔مگر بہرحال تم کو اپنے خیالات کی صفائی ضروری ہے اور لازم ہے کہ میرے ہندوستان پہنچنے کے قبل تم اپنے کو زیور شائستگی آزادی سے آراستہ پیراستہ کر ڈالو،اور میرے ساتھ عمر بھر زندگی بسر کرنے کے قابل بناؤ کیونکہ ہندوستان میں وہ دل و دماغ، وہ مزاج، وہ طبیعت، وہ مادۂ تہذیب اور وہ اخلاق لے کر نہیں آنے کا جس کے ساتھ جہاز پر سوار ہوا تھا، بلکہ میں اپنی قوم کا مصلح اور تہذیب آموز بن کر آؤں گا"۔

مذکورہ اقتباس سے نواب آزاد کی ذہانت ٹپکتی ہے اور ان کی زبان دانی کی فصاحت و بلاغت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اپنی باتوں کو نہایت سادگی و صفائی اور پرلطف انداز میں پیش کرتے ہیں۔اسے تحریر کیئے مدت گزر گئی مگر اس کی جدت ہنوز نمایاں ہے۔نواب آزاد کی تین تصنیفیں منظر عام پر آئیں۔

ا- خیالات آزاد۔ یہ نواب سید محمد آزاد کی پہلی نثری تصنیف ہے جو کہ ۱۸۸۷ء میں پروفیسر عبدالغفور شہباز کے مقدمہ کے ساتھ قومی پریس لکھنؤ سے چھپی۔قارئین نے اسے اس قدر پسند کیا کہ اس کی دوسری اشاعت رضوان پریس کلکتہ سے انجام پائی۔نواب آزاد کی انشا پردازی کی دلکشی اور دل نوازی نے طنز و ظرافت کی دنیا میں انقلاب عظیم برپا کر دیا۔ پروفیسر عبدالغفور شہباز نواب آزاد کی نثر نگاری پر اپنی قیمتی و عالمانہ رائے یوں سپرد قلم کرتے ہیں:

"یہ اس شخص کے خیالات ہیں جس نے اس کی عمدہ تاثیر سے پوری طرح استفادہ کر کے اپنی طبعی ذکاوت و ذہانت اور فطری مادہ و قابلیت کو کامل طور پر چمکایا اور مشرقی انشا پردازوں کے اکھاڑے میں مغربی اصول سے جواں مردانہ قدم رکھ کر اکثر اعلیٰ درجے کے زور آزماؤں کو صاف نیچا دکھایا۔ یہ اس شخص کے خیالات ہیں جس کا قلم آزاد رقم زمانہ دراز تک اخبار نویسی اور وقائع نگاری کی عمارت کا ایک محکم اور استوار ستون رہا ہے۔ عالم انشا پردازی

پر اس شخص کا اس قدر احسان ہے کہ فرنگستان میں مکالے کا رلائل اور گولڈ اسمتھ کا بھی اتنا ہی ہو۔اس شخص نے اپنے وسعت خیالات کے مطابق بزور ذہانت وذکاوت اردو کی انشا پردازی کے تنگ کوزے میں وہ گنجائش نکالی کہ دریا کیا دیکھتے ہی دیکھتے سمندر کی سمائی نظر آئی۔شوخی وظرافت جواس شخص کا ایک خلقی جوہر ہے وہ بھی اس آزادی کے زمانے میں بے چمکے نہ رہی اور اس کی چمک دمک اس غضب کی ہوئی کہ اکثر شپرہ چشم گھبرائے اور بہت سے صاحب نظر چکرائے۔اکثر مجالس میں ان کے قلم سے نکلے ہوئے فقرات نقل محفل بنے اور اکثر زبانوں پر ان کے بعض برجستہ جملے ضرب المثل کی طرح جاری ہوئے۔جدت پسندی سے مضمون آفرینی کا جو راستہ نکالا ایسا نکالا جس پر لوگ قدم بھی بہ مشکل رکھ سکتے ہیں،منزل مقصود کو پہنچنا تو بڑی بات ہے۔اور ساتھ اس مشکل پسندی کے عوام پسند بھی اس قدر کہ ہر شخص اس پر والا وشیدا ہے''۔

انگریزی ادب کا مطالعہ بھی نواب آزاد کا گہرا تھا۔چنانچہ ان کی تحریروں میں اس کے اثرات بھی مرتب ہوئے ہیں۔انگریزی ادب کے فن پاروں کے مطالعہ سے ان کی تحریروں میں نئے نئے خیالات اور انگریزی تہذیب کے جلوؤں کے اثرات ملتے ہیں،جس کے سبب ان کی تحریریں پرلطف،پرکشش اور دلکش نظر آتی ہیں۔وہ کلاسیکی ادیبوں میں ایک ممتاز مقام کے حامل ہیں۔انھوں نے اودھ پنچ لکھنؤ کے ادیبوں کی صف میں شامل ہوکر مغربی تہذیب کے مضر اور مہلک اثرات کو اپنے ملک میں کم کرنے کی بڑی حوصلہ افزا کاوش کی۔اس ضمن میں رشید احمد صدیقی اپنے زریں خیالات پیش کرتے ہیں:

''مغرب اور مغربیت کے خلاف نواب آزاد نے جس معقول اور دلکش پیرایہ میں طنز کیا ہے اس کا جواب بحیثیت مجموعی اردو ادب میں ملنا دشوار ہے۔آزاد کی طنز وظرافت میں جو چیز نہایت نمایاں اور بامزہ ہے وہ ان کی خلقی شگفتگی ہے۔کینہ پروری،زہرنا کی کا عنصر کہیں نمایاں نہیں ہے۔اس

اعتبار سے ان کو اردو کا ہورس اور چوسر کہنا ناموزوں نہ ہوگا۔ آزاد نے ہندوستان کے سیاسی معاشرتی رجحانات پرنہایت جامع طریق سے اظہار خیال کیا ہے۔ ان کی طنز وظرافت اتنی صحیح اور جامع اورادب وانشا کے صحیح معیار کی اس درجہ حامل ہے کہ ان کے بقائے دوام پر دورائیں ہونا تقریباً ناممکن ہے''۔

(طنزیات ومضحکات، رشید احمد صدیقی، ص:۶۷، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۹۳ء)

۲-سوانح عمری آزاد۔ یہ نواب آزاد کی دوسری نثری تصنیف ہے۔ یہ سب سے پہلے ۱۸۹۰ء میں اودھ پنچ لکھنؤ میں قسط وار چھپی اور کتابی شکل میں ۱۸۹۱ء میں صادق پریس عظیم آباد پٹنہ سے عبدالغفور شہباز کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوئی۔ انھوں نے سوانح عمری آزاد میں آپ بیتی کی روشنی میں اس وقت کی پوری تہذیب اوراس کی قدروں کی زوال پذیری کا تذکرہ بڑے واضح الفاظ اور شگفتہ انداز میں سپرد قلم کیا ہے۔ ان کے زمانہ میں یہ آپ بیتی بہت عام ہوئی اور قارئین ان کی عمدہ اور دل پذیر انشا پردازی سے بے حد متاثر ہوئے۔ طنز ومزاح کے درمیان جو ہلکا سا فرق محسوس ہوتا ہے وہی امتیاز نواب سید محمد آزاد کے اس طنزیہ ناول اور سجاد حسین کے حاجی بغلول میں پایا جاتا ہے۔ نواب آزاد نے معاشرتی اصلاح کی بڑی خوبصورت تصویر اتاری ہے۔ شہباز سوانح عمری آزاد پر یوں خامہ فرسائی کرتے ہیں:

''مصنف کی بے پناہ قوت انشا پردازی اور عمیق قوت مشاہدہ، ان کا وسیع اور صحیح تجربہ دُنیا ان کی غامض مردم شناسی اوران کی جبلی شوخی طبیعت ان کی ہر روش زندگی میں حکیمانہ شرکت، ان کی ہر طبقۂ ناس سے دانشمندانہ معاشرت صفحے صفحے سے ظاہر ہے۔ سوانح عمری کے اوراق کے دیکھنے سے ناظرین بصیرت قرین پر یہ بات صاف روشن ہوجائے گی کہ مولانا آزاد جیسے ہشت پہلو خصالی اور متضاد خیال اور کج باز اولوالعزم اور بے اصول بااصول کے خیالات کی تصویر قلم سے اس خوبی کے ساتھ کھینچنا اور مختلف پیشوں اور مشغلوں کے اسٹیج پر ایک فرضی وخیالی شخص سے اس لطف کے ساتھ مختلف

مشکل پارٹ کا کامیاب طور پر ایکٹ کرنا اس شخص کا کام ہے جس نے مکتب تجربہ میں برسوں دست تفتیش سے کتابِ انسانی کی ورق گردانی کی ہو اور ازلی قوت مطالعہ کی مدد سے ہر فصل اور ہر بات کے دقیق مطالب کو عقل کے آگے اچھی طرح حل کیا ہو۔ مولانا آزاد کی تصویر ایک کامل الفن معنوی نقاش کی استادی اور کمال کا حیرت انگیز نتیجہ ہے''

(مقدمہ از شہباز، صفحہ ۲۳)

۳-نوابی دربار۔ یہ نواب سید محمد آزاد کی تیسری ادبی کاوش ہے۔ یہ درحقیقت ایک مزاحیہ ڈرامہ ہے۔ نوابی دربار سب سے پہلے اودھ پنچ لکھنؤ میں ۱۸۷۸ء میں قسط وار چھپتا رہا۔ اس کی ادبی و اصلاحی اہمیت کے پیش نظر عبدالغفور شہباز نے اپنے قیام اورنگ آباد کے زمانہ میں اسے ترتیب دے کر ۱۹۰۱ء میں سیٹھ کندن لال پریس لکھنؤ سے شائع کیا۔ لالہ سری رام نواب سید محمد آزاد کے نوابی دربار کے متعلق لکھتے ہیں:

''سید محمد صاحب ابن سید اسد الدین حیدر جہانگیر ڈھاکہ کے قدیم باشندے آغا احمد علی کے شاگرد ہیں۔ اودھ پنچ لکھنؤ میں عرصہ تک ان کے قلم سے ظرافت کے مضمون نکلتے رہے ہیں۔ قابل دید ''نوابی دربار'' آپ ہی لکھا کرتے تھے۔ اردو انشا پردازی کے بے جان قالب میں ان کی تحریروں نے ایک روح پھونک دی۔ جدت پسندی اور ظرافت ان کی طبیعت کا خلقی جوہر ہے''۔

(خمخانۂ جاوید، صفحہ ۴۶-۴۷، لالہ سری رام-منشی نول کشور پریس لاہور ۱۹۰۸ء)

اقبال عظیم ''نوابی دربار'' پر حکیم حبیب الرحمٰن کی رائے یوں تحریر کرتے ہیں:

''نہایت پیاری اردو میں ظریفانہ ڈرامہ ہے جس میں رئیسوں کے مشاغل، مصاحبین کے ہتھکنڈے، بیگمات کی تباہ کن رسمیں غرض یہ کہ بہت سے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ زبان بہت دلچسپ اور بے حد شوخ ہے۔ پہلے یہ ۱۹۷۸ء میں 'اودھ پنچ' میں شائع ہوتا رہا۔ خیال ہے کہ اردو زبان میں

یہ پہلا ڈرامہ ہے جو اگرچہ کسی اسٹیج پر نہیں آیا لیکن اس کے بہت سے باب الگ الگ بہت بار اسٹیج ہوئے‘‘۔

(مشرقی بنگال میں اردو، صفحہ ۷۵، ڈھاکہ، اگست ۱۹۵۴ء)

نواب سید محمد آزاد نے اپنے عہدۂ جلیلہ کی اہم ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دیتے ہوئے اردو ادب کی خدمت کو اپنا اہم فریضہ سمجھا۔ اپنی اعلیٰ صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے اس میں انواع واقسام کے گل بوٹے کھلائے اور گلشنِ اردو ادب کو حسن بداماں بنایا۔ جواں سال محققین سے یہ آرزو رکھتا ہوں کہ وہ اردو ادب کے ان آبدار اور قیمتی موتیوں کو جو کہ نواب سید محمد آزاد نے ادبِ اردو کو بخش دیئے ہیں جو کہ ان کے زمانے کے مختلف رسائل مثلاً گلدستہ اودھ پنچ ہندوستان پریس لکھنؤ ۱۹۱۵ء، اودھ پنچ اخبار لکھنؤ ۱۸۷۴ء، مشیر قیصر لکھنؤ، آگرہ اخبار آگرہ، سفیر بودھانہ اور اکمل الاخبار ’رئیس اینڈ رعیت‘ کلکتہ کا ایک انگریزی اخبار ہفت روزہ‘ اڈیٹر شمبھو چند ڈے میں چھپتے رہے۔ مذکورہ اخبارات میں نواب آزاد کے شائع شدہ مضامین کی تلاش کی جاسکتی ہے۔ اس میں بڑی عرق ریزی، مستقل مزاجی، حوصلہ، محنت ولگن اور پوری توجہ کی ضرورت ہے۔ صحیح تحقیق کا حق اسی سے ادا ہوسکتا ہے۔

بقول ڈاکٹر سید اختر حسن، سید محمد آزاد کی وفات کے تقریباً ۳۰ برس بعد آپ کی تربت پر لوح نصب کی گئی۔ اس پر علامہ رضا علی وحشت کلکتوی کا فارسی قطعہ کندہ ہے:

چو بگذشت نواب سید محمد آزاد
ازیں خاکداں سوئے فردوس انور
پئے سالِ تاریخ وحشتؔ بگفتم
برفت از جہاں سید عدل پرور

اردو ادب کا یہ مایہ ناز ادیب ۱۱ دسمبر ۱۹۱۶ء/۱۳۳۵ھ میں کلکتہ میں دنیا سے رخصت ہوا۔

❖❖❖

Dr. Syed Sabir Hasan
C-314, Abul Fazal Enclave-2
Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla
New Delhi. Mob. 9801659311

وسیم حیدر ہاشمی
وارانسی

مرزا عباس بیگ محشؔر بنارسی

بات غالباً ۱۹۸۴ء کی ہے (اس وقت راقم شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی سے وابستہ تھا) شعبہ کے سابق صدر، پروفیسر امرت لعل عشرتؔ نے بات چیت کے دوران راقم کو بنارس کے انیسویں صدی کے ایک شاعر محشؔر صاحب کے سلسلہ میں بتایا کہ محشؔر صاحب کا پورا نام مرزا عباس بیگ اور تخلص محشؔر تھا۔ ان کی پیدائش ۱۸۷۹ء میں بنارس کے محلّہ دالمنڈی میں ہوئی تھی۔ محشؔر صاحب کے ایک مرقوم بیان کے مطابق، ان کے جد، محمد شاہ رنگیلا کے زمانے میں ایران سے بھارت آئے تھے۔ دہلی پہنچنے کے بعد ان کے جد کو شاہی خدمات کے لئے تقرر کرلیا گیا۔ ان کے پردادا مرزا رضا بیگ چونکہ انگریزوں کی بھارت کے خلاف سیاست سے ناراض رہتے تھے اسی وجہ سے بھارت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفؔر کے خیالات سے بہت متاثر تھے، جس کے سبب بہادر شاہ ظفؔر سے ان کی قربت بہت بڑھ گئی تھی اور وہ کھل کر انگریزوں کی مخالفت کرنے لگے۔ اسی وجہ سے ۱۸۵۷ء میں ظفؔر کا ساتھی اور معاون ہونے کی وجہ سے انھیں پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ اس پر سوز حادثہ سے دل برداشتہ ہو کر مرزا علی بیگ بنارس چلے آئے اور بنارس کو اپنا وطن بنالیا، اور بنارس کے محلّہ دال منڈی میں بس گئے۔ بنارس کے محلّہ دالمنڈی کے اسی گھر میں ان کا انتقال ہوا، جہاں وہ رہتے تھے۔ وہ شیعہ مسلمان تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم کا آغاز اردو، عربی اور فارسی سے گھر پر ہی ہوا۔ انھوں نے انگریزی تعلیم اسکول میں حاصل کی۔ کسی رکاوٹ کے بغیر انھوں نے ہائی اسکول تک انگریزی تعلیم حاصل کی۔ اسی وجہ سے موصوف کی انگریزی بہت اچھی تھی۔

محشؔر صاحب کو شاعری کا شوق صغرسنی سے ہی تھا۔ گویا وہ خاندانی نہیں بلکہ پیدائشی شاعر

تھے لیکن ان کے والد مرزا علی بیگ کو شاعری پسند نہیں تھی اس لئے انھوں نے محشؔر کو ہمیشہ شاعری سے دور رکھنے کی کوشش کی لیکن انھیں خاطر خواہ کامیابی نہیں مل سکی۔ اس ضمن میں پروفیسر عشرؔت صاحب نے جو کہانی راقم السطور کو سنائی تھی وہ نہایت دلچسپ ہے لہٰذا اسے بھی میں نے لکھ دیا۔ قوی امید ہے کہ محشؔر صاحب سے متعلق وہ کہانی قارئین کو بھی پسند آئے گی۔

ہوا یہ کہ وہ اپنے دالمنڈی والے جس گھر میں قیام پذیر تھے، جس کے سامنے 'کامدانی' (ساڑیوں، دوپٹوں اور دیگر زنانہ کپڑوں پر سونے یا چاندی کے تاروں سے بیل بوٹے بنانے کے کام کو کہتے ہیں، جو اب مشینی کام کی وجہ سے تقریباً ناپید ہو چکا ہے۔ لیکن لکھنؤ اور دوسرے کچھ ہندوستانی شہروں میں آج بھی یہ کام کہیں کہیں پر ہوتا ہے) والوں کی دوکانیں تھیں۔ انھیں میں ایک کاریگر کا نام قادر تھا، جو افیون پینے کا عادی تھا۔ افیون خریدنے کے لئے اس کا روزینہ تین پیسوں کا تھا۔ وہ کاریگر اچانک ایک روز بیمار پڑ گیا۔ اس کاریگر کی بیماری اور تکلیف سے محشؔر بہت متاثر ہوئے اور اپنی زندگی کا جو اولین شعر کہا وہ ذیل ہے:

قریب مرگ تو ہوں گے پڑے ہوئے قادر
مگر افیون نہ چھوٹے گی تین پیسے کی

تقریباً آٹھ یا نو برس کے سن میں وہ درج بالا شعر کہہ کر خوش تو بہت ہوئے لیکن والد کے خوف سے یہ بات ان سے چھپائے رہے۔ اپنا پہلا شعر محشؔر کو اتنا پسند تھا کہ وہ اسے مختلف رنگوں کی روشنائی سے سجا کر جا بہ جا لکھ دیتے، جو انھیں بہت اچھا لگتا تھا۔ ایک روز انھوں نے وہی شعر اپنے والد کے اس بستے پر بھی لکھ دیا جس میں ان کے کچہری سے متعلق ضروری کاغذات رہتے تھے۔ ایک روز کچہری کے کچھ کاغذات تلاش کرتے وقت اچانک ان کی نظر اس شعر پر ٹھہر گئی تو انھوں نے بیٹے سے پوچھا کہ یہ شعر کس کا ہے۔ چونکہ وہ موقع ٹال جانے یا غلط بیانی کا نہیں تھا اس لئے انھوں نے قبول کر لیا کہ یہ شعر انھیں کا ہے۔ پھر انھوں نے بیٹے کو تاکید کی کہ "آئندہ اگر تم نے پھر کوئی شعر لکھا تو سزا کے مستحق ہو گے۔ شاعری اچھی چیز نہیں ہے۔" والد کے اس رویہ سے محشؔر کی خوشیوں پر پانی پھر گیا مگر والد کی ڈانٹ پھٹکار کے باوجود انھوں نے شاعری چھوڑی نہیں۔ انھوں نے والد سے چھپا کر مشق سخن جاری رکھا مگر اس

خوف سے اپنا کلام کسی کو سناتے نہیں تھے کہیں یہ باتیں والد کے گوش گزار نہ ہو جائیں۔ وہ خود ہی شعر کہتے اور خود کو سنا کر دل ہی دل میں خوش ہو لیا کرتے تھے۔ گھر کے ماحول اور والد کی سختی نے انھیں کھل کر شعر کہنے سے روک دیا تھا، پھر بھی ان کا یہ فطری شوق ختم نہیں ہوا تھا۔

کچھ بڑے ہونے کے بعد ان کے حلقۂ احباب میں آغا حشر کاشمیری بھی شامل ہو گئے۔ ان دنوں آغا حشر کاشمیری کی شاعری کا چرچہ دالمنڈی میں عام تھا۔ آغا حشر کاشمیری، استاذالشعرا مرزا محمد حسن فائزؔ بنارسی کے شاگرد تھے۔ اس موقع پر یہ وضاحت بیجا نہیں کہ آغا حشر کاشمیری کا گھر بھی دالمنڈی سے متصل 'ناریل بازار' محلّہ میں تھا۔ اپنے دوستوں کی مدد سے انھوں نے میرؔ، غالبؔ، مومنؔ اور میر انیسؔ وغیرہ کے عمدہ کلام کے ذریعہ بہت سے نامور شعرا کو خوب پہچان لیا اور شاعری کے نکات سے بھی کما حقہ واقف ہو گئے۔ ان شعرا کو پڑھنے کے بعد ان کی شاعری کا شوق روز بروز پروان چڑھتا گیا۔ محشرؔ کے دوستوں نے انھیں قافیہ، ردیف اور اشعار کی دیگر عام تکنیک سے بھی واقف کروا دیا۔ وہ ایک روز آغا حشر کاشمیری کے استاد فائزؔ بنارسی سے بھی ملے اور انھیں اپنا کلام دکھایا تو فائزؔ صاحب نے ان کے کلام کو دیکھا اور درست بھی کیا۔ انھیں شاعری کی تکنیک کے تعلق سے بھی کئی باتیں بتائیں لیکن ان پر زیادہ توجہ نہیں دی، جس کی وجہ سے محشرؔ کبیدہ خاطر ہوئے لیکن انھوں نے شاعری کرنا نہیں چھوڑا۔ پروفیسر عشرتؔ کے مطابق وہ بہت دنوں تک فائزؔ صاحب کے شاگرد نہیں رہے۔ اس سلسلہ کا ذکر جب میں نے فائزؔ صاحب کی بیٹی کے نواسے جناب کاظم رضوی صاحب، جو کہ راقم کے بزرگ دوستوں میں ہیں، سے کیا تو انھوں نے مجھے فائزؔ صاحب کے شاگردوں کی جو فہرست فراہم کروائی، اس میں محشرؔ صاحب کا بھی نام موجود ہے۔ بہر حال، راقم کو پروفیسر عشرتؔ صاحب نے بتایا تھا کہ وہ شاعری کرتے رہے۔ جب شاعری میں محشرؔ صاحب کو زیادہ کامیابی نہیں ملی تو ان سے کسی نے کہا کہ شیخ علی حزیںؔ (محلّہ فاطمان) کے مزار پر چالیس جمعرات بلا ناغہ کئے حاضری دو تو تمہاری شاعری میں نکھار آ جائے گا، تو انھوں نے ایسا کیا بھی۔ اس سلسلہ میں عشرتؔ صاحب نے راقم کو بتایا کہ محشرؔ صاحب کو مسلسل چالس جمعرات علی حزیںؔ کے مزار پر حاضری دینے میں، برسات کے دنوں میں کافی پریشانی اٹھانی

پڑی مگر انھوں نے ناغہ نہیں کیا لیکن اس عمل میں محشؔر صاحب کی شاعری میں چمک آنے کے بجائے اور دھندلا پن آ گیا بلکہ ان کی شعر کہنے کی صلاحیت میں کمزوری اور کمی واقع ہوئی۔ اپنی شاعری میں اس قسم کی کمی آنے کے بعد انھوں نے غزل کہنا ترک کر دیا بلکہ غزل کی مخالفت بھی کرنے لگے اور اپنی توجہ نظم کہنے پر مرکوز کر دی۔

محشؔر صاحب کے تعلق سے اتنا بتا چکنے کے بعد انھوں نے بنارس کے شاعروں سے متعلق مجھے اپنی مشہور کتاب 'سخنوران بنارس' دی اور ساتھ میں یہ بھی کہا کہ ''اب چونکہ اس کتاب کے تمام نسخے ختم ہو چکے ہیں اور یہ واحد نسخہ میرے پاس ہے۔ اس لئے اس سے استفادہ کرنے کے بعد آپ مجھے یہ نسخہ واپس کر دیجیے گا تاکہ میں اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کروا سکوں۔'' اپنے وعدہ کے مطابق میں نے کتاب کا وہ نسخہ پروفیسر عشرؔت صاحب کو ایک ماہ بعد واپس کر دیا۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن عشرؔت صاحب کی زندگی شائع نہیں ہو سکا تھا۔ دوبارہ یہ کتاب میرے ایک دوست، ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی نگرانی میں ۲۰۱۵ء میں شائع ہو سکی۔ اس کتاب کو عشرؔت صاحب کے صاحبزادے جناب دیپک مدھوک صاحب نے شائع کروایا۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے اس کتاب کا ایک نسخہ گزشتہ برس مجھے ہدیہ کیا، جس کے لئے راقم ان کا شکر گذار ہے۔ اس کتاب میں پروفیسر عشرؔت نے محشؔر صاحب کے تعلق سے تقریباً وہی سب باتیں رقم کی ہیں، جو انھوں نے مجھ سے بتائی تھیں۔ راقم نے بنارس کے بیشتر شعرا کے ذکر کے لیے اسی کتاب سے مدد حاصل کی ہے۔

محشؔر صاحب اعلیٰ شخصیت کے مالک تھے۔ وہ چونکہ نہایت ملنسار تھے، اس لئے اکابر بنارس میں شاید ہی کوئی ایسا رہا ہو جو ان سے واقف نہ ہو۔ ہنس مُکھ مزاج، ملنسار طبیعت اور مہمان نوازی کی وجہ سے ان سے ہر کوئی متاثر ہوتا اور جلد ان کی قربت حاصل کر لیتا تھا۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد وہ 'مختار' ہو گئے تھے۔ نرم مزاجی اور مروت کی وجہ سے اپنے احباب سے وہ پیسے نہیں لیتے تھے۔ ان کے مالی حالات کے تعلق سے پروفیسر امرت لعل عشرؔت فرماتے ہیں:

''اپنی خوش اخلاقی اور دوست نوازی کی وجہ سے وہ اکثر ایسے

مقدمات کی پیروی میں رہتے تھے جو 'حساب دوستاں در دل' قسم کی چیز ہوتے تھے۔

(سخنوران بنارس۔ پروفیسر امرت لعل عشرتؔ۔ صفحہ ۹۶۔ باردوم ۲۰۱۵)

مختاری، عوام کے ساتھ اچھے برتاؤ اور شیریں زبانی کا انھیں ایک بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ وہ میونسپلٹی میں ممبر بن گئے اور کچھ دنوں بعد 'وائس چیرمین' بنے اور مختلف کمیٹیوں کے 'چیئرمین' بھی رہے۔ محشرؔ صاحب کے ہمہ وقت بیدار رہنے والے دماغ کو پروفیسر عشرتؔ ''محشر کی حشر خیزیاں'' فرماتے تھے۔ اس سلسلہ میں وہ اپنی بالا کتاب میں فرماتے ہیں:

''محشر کی رنگین مزاجی بازاوقات بڑے انوکھے گل کھلاتی تھی۔ ایک دفعہ انھیں خیال آیا کہ محض شاعرات کا ایک مشاعرہ منعقد کیا جائے۔ بنارس کے روایت پرست ماحول کے خلاف گویا یہ ایک بہت بڑی بغاوت تھی لیکن محشر اپنی دُھن کے پکے تھے۔ ۶ رمئی ۱۹۴۷ء کو بنارس میں پہلی دفعہ جے نرائن انٹر کالج کے میدان میں لیڈی سریواستو کی صدارت میں ایک دلچسپ مشاعرہ ہوا جس میں ہندوستان بھر سے ۳۳۔۳۴ شاعرات نے حصہ لیا۔ مشاعرے کی کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ ۱۹۴۹ء میں بیگم حفاظت حسین، کمشنر بنارس کی صدارت میں یہی پروگرام پھر سے مرتب ہوا اور اس میں محشر کی کوششوں سے خواتین میں ادبی ذوق کے احیا کے ساتھ ساتھ ایک زنانہ بزم ادب کا قیام بھی عمل میں آگیا۔ (ایضاً صفحہ ۹۷)

مناسب ہوگا اگر اب محشرؔ صاحب کی شاعری کا بھی کچھ ذکر کیا جائے۔ اگر عشرتؔ صاحب کی مانیں وہ بہت اچھے شاعر نہیں تھے۔ (اندازہ ہوتا ہے کہ عشرتؔ صاحب کا یہ خیال ان کی غزلوں کے ضمن میں ہوسکتا ہے کیونکہ وہ محشرؔ صاحب کی نظموں کی تعریف کھلے دل سے کرتے ہیں) محشرؔ صاحب پر لکھے ایک مضمون میں وہ رقمطراز ہیں:

''محشرؔ مرحوم بنارس کے البیلے شاعر تھے جن کے کلام میں تمام ناہمواریوں کے باوجود بعض مقامات پر حقیقی شعریت کی ایسی شمعیں نظر آتی

ہیں جس میں اردو کا کاشانۂ بزم دیر تک منور رہے گا۔ ان کا سرمایۂ شعری بہت ہی مختصر ہے لیکن ان کے اجزائے ترکیبی میں اکثر ایسے نورانی عناصر موجود ہیں جو صاحبان نظر کے دیدہ و دل کو روشن کرتے ہیں۔ عام اصطلاحات میں وہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ (ایضاً صفحہ ۹۲)

راقم نے مذکورہ بالا سطروں میں عرض کیا تھا کہ عشرتؔ صاحب کا یہ خیال غالباً ان کی غزلوں کے لیے رہا ہوگا، موصوف کی نظمیہ شاعری کے بارے میں نہیں۔ اس ضمن میں محشر صاحب کی ایک نظم پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں:

غزلوں کی اب ہماری زباں میں کمی نہیں
اس صنف شاعری میں کوئی دلکشی نہیں
دنیا یہ کہہ رہی ہے بدل دو ادب کا رنگ
اور ہم یہ کہہ رہے ہیں ''نہیں، جی ابھی نہیں''
جس میں فراق و وصل کے قصے نہ رقم ہوں
اپنا یہ اعتقاد ہے، وہ شعر ہی نہیں
اک پھول اک پرند کوئی منظرِ حسیں
موضوع شاعری ہے تو وہ شاعری نہیں
کس درجہ ہو گئے ہیں تصنع پسند ہم
کہتے ہیں اصلیت میں کوئی دلکشی نہیں
شاعر نہیں جو جھوٹ کے طوفان باندھ دے
جو اصلیت سے دور ہے، وہ شاعری نہیں
شاعر وہی ہے جو کہ حقیقت نگار ہے
جس کی دروغ و کذب سے وابستگی نہیں
افسانۂ فراق ہو یا قصۂ وصال
وہ جانتا ہے اس میں کوئی دلکشی نہیں

پڑھتا ہے وہ صحیفۂ قدرت کو رات دن
اس کی نظر سے بات کوئی چھوٹتی نہیں
ہوتا ہے اس کی روح پہ ماحول کا اثر
مصنوعی اس کا جذبۂ دل ایک بھی نہیں
وہ واردات قلب کو کہتا ہے شاعری
جو واردات قلب نہیں، شاعری نہیں
وہ حسن کائنات کی تصویر دلفریب
یوں کھینچتا ہے جس میں ذرا بھی کمی نہیں
فطرت کے دل پسند ترنم کا ساز ہے
چپ ہو تو کائنات میں پھر زندگی نہیں
جب تک نہ اس کے قلب میں ہو کیف موجزن
اس کے قلم سے شعر نکلتا کبھی نہیں
تنقید کا ہے غم نہ ستائش کی فکر ہے
اس کے خیال صاف میں پراگندگی نہیں
ہوتا ہے آج مست وہ اپنے کلام سے
غیروں کی بے خودی پہ اسے بیخودی نہیں
ہاں زندہ باد شارح اسرار کائنات
آجائے جس کو موت، تری زندگی نہیں

بنارس پر لکھی گئی بہت سی مذہبی کتب میں یہ ذکر ملتا ہے کہ کاشی میں مرنا بھی شُبھ (مبارک) ہوتا ہے۔ کاشی میں مرنے والا چوراسی لاکھ جنوں کے کشٹ (تکلیف) سے مُکت (آزاد) ہوجاتا ہے کیونکہ یہاں موت پاکر اس کا جسم مہا شمشان کی نذر ہوکر پانچوں عناصر فضا میں ضم ہوجاتے ہیں جبکہ اس کی آتما (روح) یہیں واس (قیام) کرتی ہے۔ مرزا غالبؔ نے بھی اپنی مشہور زمانہ مثنوی 'چراغ دیر' میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

کہ ہر کس کانداں گلشن بمیرد
دگر پیوند جسمانی نہ گیرد

محشرؔ صاحب یہاں رہنے والی روحوں کے سنگم کو ذیل طریقہ سے نظم کرتے ہیں:

مضطرب روحوں کا سنگم

محبت کا فراز کوہ جب پیغام دیتا ہے
فلک کی نیلگوں ساری کا آنچل تھام لیتا ہے
نسیم صبح رنگیں گل کدوں سے جب گزرتی ہے
گل نوساختہ کو چھیڑتی ہے پیار کرتی ہے
روپہلے میکدے میں جھومتی ہیں چاند کی کرنیں
ندی کا حسن سیمیں چومتی ہیں چاند کی کرنیں
گلوں میں حسن کا سرشار بھنورا جبکہ گاتا ہے
چمن میں ہر طرف بوسوں کا اک طوفان لاتا ہے
یہ ربط حسن و ضبط عشق کا پیمان محکم ہے
جسے کہتے ہیں بوسہ مضطرب روحوں کا سنگم ہے

.....اب پیش ہے محشرؔ بنارسی کی نظم کا ایک نمونہ، اسے پڑھ کر اندازہ ہو جائے گا کہ وہ نظمیں کس درجہ کی کہتے تھے۔ موصوف کی شاعری کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ وہ قدرت سے بہت قریب تھے۔ ملاحظہ فرمائیں:

میں تنہا نہیں ہوں

یہ ندی کی موجوں کے شیریں ترانے
یہ معصوم نغموں کے دلکش فسانے
یہ نکھرے شگوفے یہ گل تازے تازے
یہ شاداب وادی کے چہرے کے غازے
معطر معطر یہ دھیمی ہوائیں

کسی حسن نازک کے دل کی ادائیں
گھنی جھاڑیوں کی مسلسل قطاریں
ہوا کے اشارے پہ رقصاں بہاریں
کہیں ابر پاروں کے سائے ندی میں
حسیں جیسے کوئی نہائے ندی میں
پرندوں کے نغموں کے طوفاں فضا میں
یہ پرواز کی سنسناہٹ ہوا میں
پپیہے کی سوزندہ لَے کے اشارے
ہواؤں میں بہتے ہوئے غم کے دھارے
میں ان سب کا ہمزاد ہوں ہمنشیں ہوں
میں تنہا نہیں ہوں، میں تنہا نہیں ہوں

محشرؔ کی شاعری کے تعلق سے پروفیسر امرت لعل عشرتؔ صاحب کا خیال ایکدم درست اور ان کی شاعری کے نشیب وفراز اور طرز تحریر کی من وعن عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔ پروفیسر عشرتؔ کے درج ذیل اقتباس کو مدنظر رکھ کر اگر محشرؔ بنارسی کی تمام شاعری کا مطالعہ بغائر کیا جائے تو احساس ہوگا کہ موصوف نے ان کی شاعری کے تمام رموز کی عکاسی ایک بہترین مصور کی مانند نہایت جاذب وجالب پیرائے میں کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''مظاہر فطرت سے یہی عشق اور صحیفۂ قدرت کا یہ مطالعہ اور مشاہدہ تھا، جو پہلے محشرؔ کی زندگی بنا اور پھر رفتہ رفتہ ان کی موضوعاتی شاعری میں ڈھل کر اردو ادب میں ایک البیلے روپ میں جلوہ گر ہوا۔ برسات، بسنت، طلوع سحر، چاندنی رات، قوس قزح، ستارۂ سحری، سورج مکھی اور کنول کے پھول، جوہی، اشوک، ہرسنگار اور حُسن حنا وغیرہ عنوانات سے انھوں نے جو تخلیقات پیش کی ہیں وہ ہمارے گلشن ادب کو ہمیشہ کے لیے مہکاتی رہیں گی۔ محشرؔ کی یہ فطرت نگاری کوئی سرسری چیز نہیں۔ ان میں ایک ایسی کیفیت ہے جو شاعر کی فطرت سے گہری ہم

آہنگی کی نشان دہی کرتی ہے۔ وہ فطرت کا عکاس ہونے کے علاوہ اس کا ہمراز بھی تھا۔ غم حیات سے فرار کے لیے دامن قدرت اس کے لیے بہترین پناہ گاہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مستقل ساتھی اور ایک باوفا محبوب بھی ہے، جس سے وہ ہنستا بولتا ہے اور ہم آغوشی کی لذت بھی حاصل کرتا ہے۔ صبح کا ستارہ نظر افروز نظاروں کے ہجوم میں جب نور پاشیاں کرتا ہے تو شاعر نہ صرف یہ کہ اس سے ہم کلام ہوتا ہے بلکہ اپنے آپ کو بے خودی شوق کے سپرد کر کے اس کے سیلاب تجلی میں ڈبونے کے لیے تیار ہوتا جاتا ہے۔ اس وقت وہ اقبالؔ کی طرح فلسفیانہ موشگافیوں سے کام نہیں لیتا بلکہ شعریت کا سہارا لے کر ماحول کی جگمگاتی تصویر صفحۂ قرطاس پر اتارتا ہے‘‘(ایضاً صفحہ ۱۰۷ تا ۱۰۸)

اس تعلق سے محشر کی ایک اور نظم ملاحظہ فرمائیں:

ستارۂ سحری

صبح کے طائروں کی بزم غزل خوانی ہے
شبنم آلود پروں کی گُہر افشانی ہے
جلوہ فرما نظر افروز نظاروں میں ہے
جاگتا نیند سے بے چین ستاروں میں ہے
بڑھتی آتی ہے سحر، محوِ تمنا خاموش
چاہتی ہے کہ بنا لے تجھے آویزۂ گوش
اور نسیمِ سحری چھیڑ کے شاخوں کا ستار
کر رہی ہے تجھے نغمات کی مے سے سرشار
گہر افشانی شبنم کو بہک جاتی ہے
اس کی سرشاری سے پھولوں کو ہنسی آتی ہے
تیرے نظاروں میں کلیاں ہیں یہاں تک بیتاب
برگ نازک کی اُلٹ دیتی ہیں رہ رہ کے نقاب

ہلکی ہلکی سی یہ دریائے فلک کی امواج
چومتی ہیں ترے پیشانی زرّین کا تاج
ان کی بیباکی سے تجھ کو جو حیا آتی ہے
ایک لرزش سی ترے جسم میں آجاتی ہے
میں ترے حسن کے سیلاب میں بہتا جاؤں
اس طرح تیرے قریب اور قریب آجاؤں
اپنے حُسنِ نظر افروز میں کھو دے مجھ کو
اپنے سیلاب تجلّی میں ڈبو دے مجھ کو

پروفیسر امرت لعل عشرت صاحب، محشؔر کی دیگر صلاحیتوں کا تعارف کرواتے ہوئے ایک مقام پر ان کی صحافت کا تذکرہ ذیل طریقہ سے کرتے نظر آتے ہیں:

''محشؔر شاعر اور ادیب ہونے کے علاوہ اچھے صحافی بھی تھے۔ صحافت کے لیے وہ اپنی قانونی مصروفیتوں کے باوجود کچھ نہ کچھ وقت نکال ہی لیا کرتے تھے۔ ان کا روزنامہ ''آواز'' بنارس کے سیاسی حلقوں میں کافی مقبول تھا۔ اس اخبار کا ہفت روزہ خاص نمبر علمی اور ادبی تخلیقات کا بھی حامل ہوتا تھا جس کے سبب سنجیدہ لوگ بھی اس کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ ''آواز'' کے بعد محشؔر نے ۱۹۴۷ء میں روزنامہ ''آزاد'' کا اجرا کیا جو آج تک، ان کے انتقال کے بعد بھی خاصی پابندی سے نکل رہا ہے۔ محشؔر کی طبیعت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ان کی بیاض محشرستان میں ''ظرافت وطنزیت'' کے عنوان سے کافی اشعار دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے سیاسی اور سماجی ماحول کے معائب کو اجاگر کرنے اور اس کے مضحکہ خیز رخ کو بھی پیش کرنے میں انھیں بڑا مزہ آتا تھا۔ اسی مزاح نگاری کے شوق میں انھوں نے ایک ماہ نامہ اخبار ''حماقت گزٹ'' کے نام سے جاری کیا۔ جو اگرچہ زیادہ دیر تک سانس نہیں لے سکا لیکن اس کی عارضی حیات بھی اہل دل کے لیے دائمی کیف ومسرت کا پیغام تھا۔ (ایضاً صفحہ ۹۷ تا ۹۸)

محشؔر کی صحافت پر روشنی ڈالنے کے بعد موصوف اپنے کمیت قلم کی عنان کو ان کی زندگی کے آخری ایام کی طرف پھیرتے ہوئے قصیدے کے گریز کی مانند فرماتے ہیں:

محشؔر کی زندگی کے آخری دس سال مختلف امراض کی نذر ہو گئے۔ ۱۱ر فروری ۱۹۴۶ء کی شام کو ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا۔ مسلسل علاج سے وہ اس سے جاں بر تو ہو گئے لیکن ہائی بلڈ پریشر کی شکایت نے انھیں ہمیشہ کے لیے مریض بنا دیا۔ عمر کے اس حصے میں ان کی زندہ دلی اور صحت دونوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ افسردگی کے اس عالم میں انھوں نے اپنی ایک تخلیق میں ''حال'' کے عنوان سے اپنی کیفیت یوں بیان کی ہے۔

وہ ہاتھ جو تھرتھرا رہے ہیں اب اُن سے ساغر اُٹھا رہا ہوں
جو عہد رنگیں گزر چکا ہے، پھر اس کو واپس بُلا رہا ہوں
تھکی ہوئی زندگی لیے ہے، شباب رفتہ کا جام رنگیں
شراب تھوڑی سی بچ گئی ہے اب اسمیں آنسو ملا رہا ہوں
یہ زندگی کوئی زندگی ہے، نہ قہقہے ہیں نہ چہچہے ہیں
زبان سے بند زمزموں کی، خموش نوحے سُنا رہا ہوں
نہ اب ہے حسن خرام ساقی، نہ ساغروں میں شراب باقی
حسین ماضی کی دلربا آ، میں منّتوں سے بُلا رہا ہوں
ہوائے غم سنسنا رہی ہے، چراغ دل کے بُجھا رہی ہے
امید مردہ کی آڑ لے کر میں ان کو پھر سے جلا رہا ہوں
وہ پیاس دل کی شراب رنگیں، لبوں کی جس کو بُجھا چکی ہے
اُداس راتوں کے غمکدے میں اب آنسوؤں سے بُجھا رہا ہوں
یہ شور کیسا مچا رہی ہے، کہیں نہ احباب میرے سُن لیں
بلا اشاروں سے موت مجھ کو میں تیرے نزدیک آ رہا ہوں
حیات کی دھڑکنیں کہاں ہیں، فریب دیتا ہوں زندگی کو
رُکا ہُوا ہے دلِ فسردہ میں اس کو جھولا جھلا رہا ہوں

بہار کے زمزمے خزاں میں، ستم ظریفی نہیں تو کیا ہے
خزاں رسیدہ ہوں آہ محشرؔ، خزاں کے نوحے سُنا رہا ہوں

(ایضاً صفحہ ۹۸ تا ۹۹)

پروفیسر امرت لعل عشرتؔ صاحب کے مطابق محشرؔ صاحب کی طولانی بیماری اور خراب صحت کی وجہ سے ان کی زندگی کے آخری ایام اچھے نہیں گزرے۔ انھیں کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

''دوشیزہ فطرت کی یہی ادائیں تھیں جنھوں نے محشرؔ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مسحور کر دیا تھا۔ پرستارِ مجاز ہونے کے باوجود وہ فطرت کے ان ہی حقائق کے ایسے دلدادہ تھے اور یہ نظارے ان کی آنکھوں میں اس دل فریبی کے ساتھ سما گئے تھے کہ آخری عمر میں جب وہ مفلوج ہو گئے اور ہائی بلڈ پریشر کی تکلیف نے سیر وسیاحت کی خوشی چھین لی تو وہ DAFFODILS کے شاعر ورڈز ورتھ کی طرح عالم تصور ہی میں ان مسرت افزا نظاروں سے لطف اندوز ہوتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کو ایک استفسار کے جواب میں انھوں نے لکھا تھا '۱۹۴۶ء کی ۱۳ر فروری کی شام کے وقت مجھ پر بائیں جانب فالج کا حملہ ہوا۔ حملے کے بعد دو ماہ میں میرے اعضا جن پر فالج کا اثر تھا درست ہو گئے۔ البتہ ضعف اعصاب اختلاج اور ہائی بلڈ پریشر کی تکالیف کم وبیش قائم رہیں۔ اس وقت جب کہ خرابی صحت سے نہ تو جوئباروں اور آبشاروں میں نہا سکتا ہوں نہ سرسبز جنگلوں، شاداب وادیوں میں دن گذار سکتا ہوں، ان تمام دل بستگیوں کا دروازہ مجھ پر بند کر دیا گیا ہے لیکن عالم خیال میں ان حیات بخش مناظر سے ہمکنار ہوتا رہتا ہوں اور خوش ہوں'' (ایضاً صفحہ ۱۰۶ تا ۱۰۷)

❖❖❖

Waseem Haider Hashmi
B-10/43, Shivala,
Varanasi-221001
Mob-9451067040
email-whh55bhu@gmail.com

ابراہیم اعظمی
لکھنؤ

نورالحسنین کی افسانہ نگاری کا تنقیدی تجزیہ

جس وقت تحریکِ آزادی شباب پر تھی اس وقت بمبئ ذریعہ معاش کا اہم مرکز تھا۔ لوگ ملک کے مختلف حصوں سے ہجرت کر کے بمبئ میں داخل ہو رہے تھے جس میں ایک بڑا طبقہ ادیبوں کا بھی تھا۔ پریم چند سے لے کر کرشن چندر، منٹو، بیدی، عصمت اور خواجہ احمد عباس جیسے اعلیٰ پایہ کے ادیبوں نے ممبئ کی ادبی محفل کو رونق بخشی ۔ یہ شہر اس وقت جدید افسانہ کا مرکز تھا۔ جب یہاں کے ادیبوں نے ترقی پسند تحریک میں شمولیت اختیار کی تو ادبی دنیا میں ایک انقلاب آ گیا۔ اس تحریک نے جہاں دبے کچلے افراد کی زندگی اور ان کے مسائل کو موضوع بنایا وہیں ظالموں اور سرمایہ داروں کے ظلم و بربریت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ ترقی پسند تحریک کا دور اردو افسانہ نگاری کا عہد زریں کہا جا سکتا ہے۔ اس وقت ہندوستان مختلف مسائل سے دوچار تھا۔ عدم مساوات اور معاشی بحران کا مسئلہ ابھی حل بھی نہیں ہوا تھا کہ ملک کی تقسیم کا سانحہ پیش آیا، تقسیم ہند کے سانحے اور اس کے ردعمل کے طور پر رونما ہونے والے فسادات نے لوگوں کو ذہنی کرب میں مبتلا کر دیا۔

اس دوران انسانیت کو شرمسار کر دینے والے حادثات اور ہجرت کے کرب نے لوگوں کو بے حس بنا دیا جس نے ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو سلب کر لیا، جہاں ان مسائل کی وجہ سے اردو افسانے کے موضوعات کو وسعت حاصل ہوئی، وہیں موضوعات کی یکسانیت نے اکتاہٹ پیدا کر دی اور مقلدین کی بھرمار نے ادب کو نعرہ بنا دیا جس کی وجہ سے اس تحریک کا زور، روز بروز ختم ہوتا چلا گیا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد اردو افسانے میں تجربات اور

ردوقبول کے دور کا آغاز ہوا۔ان تجربات نے جہاں اردو افسانے کو مروجہ اسلوب سے باہر نکالا وہیں اردو افسانے کو نئے معنی و مفاہیم بھی عطا کئے۔ جدیدیت کی یہ تحریک ادب کے ساتھ ساتھ اسلوب اور موضوعات میں بھی شعوری طور پر تبدیلی کی خواہش مند تھی۔ چنانچہ اظہار خیال کیلئے نئے اسلوب کی تشکیل کا عمل شروع ہوا اور یہیں سے اسلوب کی سطح پر تجربات کے دور کا آغاز ہوا۔ موضوعات میں انفرادیت اور نئے پن کی جستجو نے انھیں اجتماعی موضوعات سے دور کردیا۔کبھی افسانے میں کردار کو،کبھی کہانی کو رد کیا گیا۔افسانہ نگار اپنی بات اشاروں، کنایوں،تشبیہات واستعارات میں بیان کرنے لگا۔حقیقت نگاری کا اسلوب علامتی اور تمثیلی پیرایہ بیان اختیار کرتا چلا گیا۔اسی دور میں قاری تلازمہ خیال،خودکلامی،شعور کی رو کی تکنیک اور آپ بیتی جیسے اسلوب سے متعارف ہوا۔۱۹۷۰ء کے بعد اردو افسانہ نگاری کا اہم مرکز مہاراشٹر رہا۔

ماہر افسانہ نگار نورالحسنین 19 مارچ 1950 کو اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔نورالحسنین کا تعلق نقش بندی سلسلے کے ایک صوفی خاندان سے ہے۔ ان کا مکمل نام سید نورالحسنین نقشبندی ہے۔ان کے اجداد تاجکستان کے شہر خُجند سے ہجرت کر کے لاہور پہنچے اور مقام ایمن آباد میں سکونت پذیر ہوئے۔ وہاں انہوں نے خانقاہی نظام قائم کیا۔اُن کے ایک جد سید شاہ عنایت الٰہی ہجرت کر کے برہان پور پہنچے۔وہاں سے مہاراشٹر کے علاقے بالاپور پہنچے اور وہاں نقشبندیہ خانقاہ کی بنیاد رکھی۔ان کے پوتے سید شاہ قمرالدین نقشبندی اورنگ آباد (دکن) پہنچے۔

مشہور شاعر سکندر علی وجؔد ان کے ننھیالی رشتہ دار تھے اور حماعت علی شاعر ان کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ ایسے ادبی ماحول میں نورالحسنین قلم نہ سنبھالتے تو کیا کرتے۔ ساتویں جماعت سے ان کے ہاتھ میں قلم آگیا تھا۔میٹرک کے بعد مزاحیہ کالم لکھنے لگے جو مقامی اخبارات میں شائع ہوتے تھے۔لیکن قلم کار بننے سے پہلے وہ ایک ڈرامہ آرٹسٹ بن چکے تھے۔وہ اسکول کے ڈراموں میں حصہ لیتے تھے۔نورالحسین شاعر بننا چاہتے تھےلیکن بن نہیں سکے اور نثر میں قلم آزمائی کرنے لگے۔انہوں نے پہلی کہانی بچوں کے لئے 'انسانیت' کے

عنوان لکھی۔اس کہانی کی اشاعت سے انہیں خوشی بھی ہوئی اور ڈر بھی لگا۔ڈر کی وجہ یہ تھی کہ ان کے خاندان میں اسکولی تعلیم سے ہٹ کر بچوں کے اس طرح لکھنے پڑھنے پر پابندی تھی۔ لیکن وہ چوری چوری لکھتے بھی رہے اور چھپتے بھی رہے۔اگر یہ کہا جائے کہ نورالحسنین کو افسانہ نگار بنانے میں ان کے اندر موجود آرٹسٹ کا ہی ہاتھ ہے تو شاید غلط نہیں ہوگا۔

ساتویں جماعت سے لکھنے لکھانے کا جو سلسلہ نورالحسنین نے شروع کیا تھا وہ چار افسانوی مجموعہ جات، چار ناولوں، تنقید کی پانچ کتابوں اور بچوں کے لئے کہانیوں کے تین مجموعات اور ایک ڈرامے کے بعد بھی مسلسل جاری ہے۔نورالحسنین ادب کی تخلیق کے عمل میں تجربات کرتے رہتے ہیں۔وہ چونکہ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اسٹیج سے جڑے رہے ہیں اس لئے انہوں اپنے افسانوں اور ناولوں میں 'فلیش بیک تکنیک' کے علاوہ 'شعور کی رو'، 'خود کلامی' اور منظری تکنیک کا بھی استعمال کیا ہے۔تصوف اور عصری مسائل پر مبنی اپنے ناول 'تلک الایام' میں بھی انہوں نے تکنیکی تجربے کئے ہیں۔ وہ عالموں اور صوفیوں کے خانوادے میں پیدا ہوئے۔ان کے خاندان کے بزرگوں کی حیات اور اُن کی تعلیمات کا کتابوں اور مختلف تذکروں میں ذکر ہے۔اُنھیں کردار بنانے کے لیے نورالحسنین نے Schizophrenia نامی ایک مرض کا سہارا لیا جس کے مریض کو عجیب عجیب چہرے نظر آتے ہیں۔وہ اُن سے باتیں بھی کرتا ہے۔وہ ایسے مناظر بھی دیکھتا ہے جہاں وہ کبھی گیا ہی نہیں ہوتا ہے۔

اس مرض کا سہارا لیکر ہی وہ یہ اچھوتا ناول لکھنے میں کامیاب ہو سکے۔نورالحسنین کے 'چاند ہم سے باتیں کرتا ہے' ناول میں فارمیٹ سے بغاوت نظر آتی ہے۔انہوں نے اس ناول میں کئی کہانیوں کو جوڑنے کی وہی تکنیک استعمال کی ہے جو 'مہابھارت' میں نظر آتی ہے،اس ناول میں ایک کے بعد ایک کئی کہانیاں آتی ہیں لیکن اصل کہانی قائم رہتی ہیں۔ یہ ناول عشق کے موضوع پر ہے، وہ اپنے ناولوں کے لیے بہت ہوم ورک کرتے ہیں۔موضوع سے متعلق مطالعہ کرتے ہیں۔نوٹس تیار کرتے ہیں۔ضرورت پڑنے پر قدیم پینٹنگس کی تلاش کرتے ہیں۔نقشوں کی مدد لیتے ہیں۔تاریخ اور جغرافیہ کی کتابیں کھنگالتے ہیں۔شاید اسی

لیے کہا جانے لگا کہ نورالحسنین نے ناول نگاری کو بھی ریسرچ ورک بنا دیا ہے۔ممتاز افسانہ نگار وناول نگار ڈاکٹر عبدالصمد کا خیال ہے کہ:

''قرۃ العین حیدر کے بعد نئی نسل میں نورالحسنین ہی ہیں جو ناول کے لکھنے سے پہلے تحقیقی مواد جمع کرتے ہیں۔''

نورالحسنین اپنی ادبی زندگی کے بارے میں ایک انٹرویو میں خلاصہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''میری ادب میں انٹری ہی بچوں کے ادب سے ہوئی۔ جب میں خود بچہ تھا، اُس وقت بھی لکھتے وقت میں اپنے آپ سے سوال کرتا تھا کہ میری خواہشات کیا ہیں؟ میرے دوست مجھ سے کس قسم کی کہانی سننا پسند کرتے ہیں۔ رہی بات لفظیات کی تو وہ وہی ہوتے تھے جنھیں میں استعمال کرتا تھا۔ عمر کے ساتھ ہی ساتھ میں افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوگیا تھا اور بچوں کے لیے لکھنے کا شوق مجھ سے جدا ہوگیا تھا۔لیکن قسمت مجھ سے پھر ایک بار یہ کام لینا چاہتی تھی۔ چنانچہ جب میں ریڈیو کی ملازمت میں آیا تو بچوں کے پروگرام کے لیے پھر مجھے بچوں کے لیے کہانیاں لکھنا ضروری ہوگیا۔ اب میں بچوں کی نفسیات، اُن کی شرارتیں، اُن کی پسند کے ساتھ ہی اور بھی بہت سارے موضوعات پر لکھنے لگا تھا، جیسے درخت کیوں ضروری ہیں، بارش کیسے ہوتی ہے، اسکول کا پہلا دن کیا خوشیاں لاتا ہے۔ والدین کی اطاعت اور فرمابرداری سے خود بچوں کو کیسا محسوس ہوتا ہے۔اس کے لیے کچھ فینٹاسی بھی لکھی تاکہ بچوں کا دل بہل سکے۔ میرا خیال ہے ادب اطفال کی تخلیق کے لیے ان باتوں پر بھی دھیان دیا جائے تو بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ بعد میں ان ہی کہانیوں کو ایک جگہ جمع کر کے میں نے ''گڈو میاں'' چوتھا شہزادہ، اور بچوں کیلئے ڈراموں پر مشتمل ایک کتاب ''حضور کا اقبال بلند رہے'' شائع کر دی تھی۔ان کتابوں کو بچوں نے بے حد پسند کیا''۔

('افسانے کا ارتقاء ہر لحاظ سے ہوا ہے' انٹرویو۔ڈاکٹر غضنفر 51 2022)

۱۹۸۰ء کے بعد مہاراشٹرا میں لکھے گئے افسانوں میں سلام بن رزاق کا افسانہ ''آخری کنگورہ''، نورالحسنین کا ''فقط بیان تک'' اور ''سبزہ نوررستہ کا نوحہ''، مشتاق مومن کا ''ترنت شور مچا یئے اور انعام پایئے''، ساجد رشید کا ''سونے کے دانت''، انور خان کا ''حق''، ''گڑھی میں اترتی شام'' اور ''فنکاری''، انور قمر کا ''فضول کا غذات میں ملے تین خط''، احمد عثمانی کا ''اپنی مٹی'' اور اشتیاق سعید کا افسانہ ''ہل جوتا'' وغیرہ مہاراشٹر کے نئے افسانوں میں اولیت کے حامل ہیں۔ بیسویں صدی کی آخری دہائی میں مہاراشٹر کے افسانہ نگاروں نے موضوعات کی یکسانیت اور مروجہ افسانوی اسلوب کے خلاف آواز بلند کی اور اس کہانی کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے جس میں دل کے دھڑکنے کی صدا واضح طور پر سنی جا سکے اور کہانی روح کی تسکین کا ذریعہ بن سکے۔ جس میں شہری زندگی کے مسائل اور زندگی بسر کرنے کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ ان کی آرزوئیں اور تمنائیں انگڑائیاں لے رہی ہوں اور معاشرے کے ایک ایک پہلو کو اجاگر کر سکے، جہاں کہانی اسلوب کے پردے میں نہ چھپ جائے۔ اس احساس کے زیر اثر مہاراشٹر کی اردو افسانہ نگاری نے اپنا رخ بدلا جو کہ نہ تو اپنے پیش رو افسانہ نگاروں کے مشابہ تھا اور نہ ہی بالکلیہ جدیدیت کا منحرف، جس کے نتیجے میں ایک ایسے افسانے کا چہرہ سامنے آیا جسے ناقدین نے ''نئے افسانے'' کے نام سے منسوب کیا، جو کہ افسانہ نگاروں کے فطری تقاضوں کو اپنے اندر پوری طرح سموئے ہوئے تھا۔ اس دور کے افسانہ نگاروں نے جہاں کہانی پن کے انحراف کو رد کیا، وہیں علامتی افسانوں کی با معنی گیرائی اور گہرائی کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ اس نئے افسانے کی کامیابی کا سہرا سلام بن رزاق کے سر ہے۔ مگر ان کے شانہ بشانہ مہاراشٹر کے دوسرے افسانہ نگاروں نے بھی اسے ترقی دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

آج مہاراشٹر میں اردو افسانے کی یہ مستحکم بنیاد انھیں افسانہ نگاروں کی کوششوں اور کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ عصر حاضر کے مہاراشٹر کے افسانہ نگاروں میں سلام بن رزاق، انور قمر، ساجد رشید، انور خان، نورالحسنین، حمید سہروردی، مقدر حمید، سید محمد اشرف، معین الدین جنابڑے، بلراج مین را، بانو سرتاج، احمد عثمانی، ایم مبین، عارف خورشید، مشتاق مومن، قاضی

مشتاق، محمود ایوبی، علی امام نقوی، مظہر سلیم، اشتیاق سعید، رحمٰن عباس، مشتاق رضا، عظیم راہی، م۔ ناگ، طارق کولہاپوری، اقبال نیازی اور براق مرزا وغیرہ کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ ترقی پسند تحریک نے مہاراشٹر میں جو اردو افسانہ نگاری کا بیج بویا تھا آج وہ توانا درخت بن کر کئی جدید افسانہ نگاروں کیلئے راحت کا سبب بن گیا ہے۔ نورالحسنین 1980 کے بعد کے افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ہے۔

وہ پچھلے 40 برسوں سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ اب تک ان کے چار افسانوی مجموعے، سمٹتے دائرے 1985، مور رقص اور تماشائی 1988، گڑھی میں اترتی شام 1999، فقط بیان تک 2012 شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانے نہ ترقی پسندی کا پروپیگنڈہ ہیں نہ ہی جدیدیت کے مہر زدہ ہیں۔ نورالحسنین کہتے ہیں، جنسیات انسانی زندگی میں اتنی ہی ہے جتنا کھانے میں نمک۔ اس لیے ان کے افسانوں میں جنسیات کا دخل بہت کم ہے۔ تہذیب و اخلاق کا زوال اور ماضی کی بازیافت ان کے پسندیدہ موضوعات معلوم ہوتے ہیں۔ گڑھی میں اترتی شام، کلمہ گو، پیتل کی چھئیاں، بیساکھیوں پر کھڑے لوگ، بھور بھئی جاگو، ایک اداس شام وغیرہ ان کے نمائندہ افسانے ہیں۔

افسانہ ''ایک اداس شام'' آنکھوں کے سامنے ابھرتے ماضی کے جھلملاتے اور آپ ہی تحلیل ہوتے خوش گوار مناظر اور یادوں کے سہارے آگے بڑھتی کہانی ہے۔ کہانی دھیرے دھیرے قاری کو یوں جکڑ لیتی ہے کہ اسے یہ اپنی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ اخلاص و محبت میں ڈوبا ہوا ایک ہنستا کھیلتا مخلوط خاندان جہاں امی، ابا، چچی اور دادی منو میاں کو منانے میں لگے ہیں۔ بعد میں منوں میاں کی پسند کی شادی ہوئی اور چولہے الگ ہو گئے، گھر کا بٹوارہ ہوا اور ساری خوشیاں وقت کی چکی میں پس کر ریزہ ریزہ ہو گئیں۔۔۔۔ اب ناراض منو میاں کو منانے والی کوئی آواز کانوں تک نہیں آ رہی ہے۔

پہلے لوگ اپنے بزرگوں کے فرماں بردار ہوا کرتے تھے۔ نہ لڑکے کو لڑکی دکھائی جاتی تھی اور نا ہی لڑکی کو لڑکا۔ وہ کہاں اپنے پسند کی شادیاں کرتے تھے پھر بھی اللہ نے ان کے رشتوں میں وہ تاثیر رکھی تھی کہ ایک ان دیکھے ساتھی کی محبت میں پوری زندگی گزار دیا کرتے تھے۔ آج

کل تو بات بات پر سیز فائر کا معاہدہ ٹوٹ جاتا ہے اور نوبت طلاق تک پہنچ جاتی ہے۔

''کل شام بیوی سے ان بن ہوگئی تھی۔ تب سے تنہا بھوکا پیاسا پلنگ
پر اوندھا منہ پڑا ہوں۔ منانے والی کوئی آواز میرے کانوں تک نہیں پہنچ
رہی ہے کیونکہ مقابل کے کمرے میں ناراض بیوی اور بچے ٹی وی دیکھ رہے
ہیں اور میں انتظار کر رہا ہوں کہ کوئی چپکے سے آکر مجھے منا لے۔۔۔۔۔''

یہ ایک عمدہ و دلخراش کہانی ہے۔ یہ نورالحسنین کے قلم کی سحر البیانی ہے کہ جس نے منوں میاں کے ذہن کی اسکرین پر بنتے ماضی کے دائروں سے بچپن کی سیر کرا دی ہے۔ اس کہانی میں نورالحسنین نے فلیش بیک کے واقعات کو اسکرین پلے کی تکنیک میں ڈھالا ہیں۔ اس لیے کہانی کا ہر منظر ایک اکائی ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے مربوط ہے۔

افسانہ ''کلمہ گو'' دکنی ماحول و فضا میں سانس لیتا ہے، جس میں کرداروں کی زبان اپنے ماحول اور علاقے کی ترجمان ہے۔ یہ ایک ابو دادا نامی غنڈے کی کہانی ہے، جس میں خامیوں کے ساتھ ساتھ چند خوبیاں بھی جمع ہوگئی ہیں۔ اس کا اصل کاروبار سود کا ہے اور حسن اس کی کمزوری ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ رحم دل بھی ہے۔ غریبوں کی مدد بھی کرتا ہے اور جمعہ کے دن کوئی برا کام نہیں کرتا۔ ایک انگریز طالبہ ماریا برونٹ ابو دادا سے سود پر پانچ ہزار روپئے لیتی ہے۔ ابو دادا اس کے حسن کا دیوانہ ہے۔ پیسے ادا نہ کر پانے کی صورت میں ایک دن ماریا پیسوں کے عوض اپنے آپ کو یہ کہتے ہوئے ابو دادا کے سامنے پیش کرتی ہے ''ہم انگریز کمیونٹی کبھی کسی کا احسان نہیں رکھتا۔'' تب ابو دادا کا ایمان بھی جوش مارنے لگتا ہے اور وہ کہتا ہے ''ماریا ہم مسلمان ہیں۔۔۔۔ کلمہ گو۔۔۔۔ کس چیز کی کیا قیمت ہوتی ہے۔ وہ ہم بھی جانتا ہے۔۔۔۔''

افسانہ ''بھور بھئی جاگو'' کی شوٹنگ نورالحسنین نے ریاست کیرالہ کے دیہات اندلور سے شروع کی۔ اس کے بعد منگلور، کریم نگر، ایلورہ ہوتے ہوئے واپس اندلور پہنچ گئے۔ ہر مقام کے لحاظ سے منظر نگاری اور زبان و بیان کا انھوں نے پورا خیال رکھا ہے۔ کنجو پائتما (فاطمہ)، احمد علی اور کنجو پائتما کے والد افسانے کے اہم کردار ہیں۔ کنجو پائتما ایک پڑھی لکھی

لڑکی ہے جو کیرالہ کے ایک دیہات اندلور سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ ماں کی ممتا سے محروم ہے۔ اس کے والد حکیم و عامل ہیں۔ افسانے کا دوسرا اہم کردار احمد علی آثار قدیمہ کا ملازم ہے۔ جو پہلی نظر میں ہی کنجو پائتما پر عاشق ہو جاتا ہے۔ افسانے میں شعور کی رو سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ کہانی کی شروعات رومانی انداز سے ہوتی ہے اور اختتام مسلمانوں کے 73 فرقوں کے ایک ہو جانے کی خواہش پر ہوتا ہے۔ نورالحسنین مسلمانوں کے 73 فرقوں سے، مسلکی جھگڑوں سے اور اسلامی تہذیب و تمدن کے مٹتے ہوئے نقوش سے دکھی ہیں۔ وہ اسلام کے شاندار ماضی کی بازیافت چاہتے ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری ایک بامقصد افسانہ نگاری ہے لیکن ان کا مقصد فن پر حاوی نہیں ہوتا ہے۔

''گڑھی میں اترتی شام'' 1948 کے پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد کے ماحول میں لکھا گیا افسانہ ہے۔ پولس ایکشن سے قبل شیروں کا شکار کرنے والے کریم الدین کہانی کے مرکزی کردار ہیں۔ وہ تیتر باز ہیں۔ اور تیتروں کا شوق انھیں اس وقت ہوا جب پولس ایکشن میں ان کی بندوق چھین لی گئی تھی۔ کریم الدین کے علاوہ زمیندار فاطمہ خالہ، زمیندار کا پوتا خورشید، نائی کاشی ناتھ اور بوڑھا گھسڑی افسانے کے جیتے جاگتے کردار ہیں۔

پیپل کی چھئیاں مہاراشٹر کے ایک نہایت سخت گیر مذہبی برہمن خاندان کی کہانی ہے، جس میں مذہب کے غلط تصورات کے خلاف احتجاج و کشمکش افسانے کا نقطہ عروج ہے۔ پنڈت روی شاستری، ان کے دو بیٹے وجے شاستری اور اجے شاستری افسانے کے اہم کردار ہیں، جس میں وجے شاستری کٹر مذہبی روایات اور اندھے عقائد کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ افسانے میں پیپل کی کونپل کو اکھاڑ پھینکنا اندھے عقائد ماننے سے انکار کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

افسانہ ''بیسا کھیوں پر کھڑے لوگ'' میں جذباتی و نفسیاتی الجھنوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ افسانہ مادی خوشحالی اور روشن مستقبل کے لیے بچوں کو بیرون ملک بھیج دینا اور پھر ان گنت یادوں کے سہارے زندگی کے مشکل دن گزارنے والے لوگوں کی کہانی ہے، جس میں زندگی گھڑی کے پنڈولم میں قید ہو کر رہ گئی ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار حیدر ہے، جس کے

جذبات واحساسات پورے افسانے پر چھائے ہوئے ہیں۔ بہترین طرز بیان اور فلسفیانہ رنگ نے افسانے کو شہکار بنا دیا ہے۔ آیئے اب دیکھتے ہیں نورالحسنین کا فن اہل ادب کی نظر میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر قمر رئیس نورالحسنین کے بارے میں لکھتے ہیں: ''آپ کے فنی رویے میں خاصی تازگی اور تہہ داری ہے، اور بڑی بات یہ ہے کہ آپ ہم عصر زندگی کے جلتے ہوئے مسائل سے منحرف نہیں ہیں۔'' جیلانی بانو، حیدرآباد نورالحسنین کے بارے میں لکھتی ہیں: ''آپ کے ہاں کہانی سنانے کا جو انداز ہے، وہ افسانے کے موضوع کی اہمیت بھی بڑھا دیتا ہے''۔ نیر مسعود نورالحسنین کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''آپ کو کہانی بیان کرنے کا سلیقہ ہے۔'' سلام بن رزاق، ممبئی سے نورالحسنین کے بارے میں لکھتے ہیں: ''ماضی کی بازیافت نورالحسنین کے پسندیدہ موضوعات میں سے ہے۔'' بشر نواز، اورنگ آباد سے نورالحسنین کے بارے میں لکھتے ہیں: ''اس کے ہاں کہانی بنتی ہے۔'' شوکت حیات، پٹنہ۔ نورالحسنین کے بارے میں لکھتے ہیں۔'' 1970 کے بعد جدید افسانوں میں جن مثبت تبدیلیوں کی باتیں میں کرتا ہوں ان کی جھلکیاں آپ کی بعض کہانیوں میں ملتی ہیں''۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، نورالحسنین کے بارے میں لکھتے ہیں: ''نورالحسنین کا فن روشن امکانات کا حامل ہے۔ ان کے یہاں موضوعات میں تنوع اور مشاہدے کا عام فہم زبان میں اظہار ہے''۔

نورالحسنین کے افسانوں کے پلاٹ مربوط ہوتے ہیں۔ اور واقعات میں ترتیب ہوتی ہیں۔ وہ کہانی میں ماحول کی ہو بہو تصویر کھینچتے ہیں۔ افسانے کے موضوع کی مناسبت سے اسلوب کا انتخاب کرتے ہیں۔ افسانے میں اپنے نقطہ نظر کو زیادہ نمایاں ہونے نہیں دیتیں۔ آخر میں کوئی فیصلہ نہیں سناتے سب کچھ قاری پر چھوڑ دیتے ہیں۔ کرداروں کو بڑی محنت سے گڑھتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کے لیے ایک ماحول منتخب کرتے ہیں۔ پھر اس ماحول میں ان کرداروں کو بساتے ہیں۔ انہیں زندگی عطا کرتے ہیں اور ماحول کے عین مطابق انھیں زبان عطا کرتے ہیں۔ ان کے کردار ملی جلی کیفیت کے حامل ہوتے ہیں، جن میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیاں بھی ہوتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں ایک تاثر ہوتا ہے جو قاری کے

دل مسحور کر لیتا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری کی طرح نورالحسین بھی دھیمے لہجے سے افسانے کی شروعات کرتے ہیں۔ پھر دھیرے دھیرے کشمکش اور اضطراب سر اٹھاتے ہیں اور ایک تجسّس پیدا کر دیتے ہیں۔

بقول آل احمد سرور: ''راجندر سنگھ بیدی اینٹ پر اینٹ رکھ کر افسانہ تعمیر کرتے ہیں۔ ان کا ہر افسانہ تراشا ہوا ہیرا ہے۔'' اور بقول کنہیا لال کپور ''راجندر سنگھ بیدی تفہیم کا بادشاہ ہے۔''

بس یہ دونوں قول مجھے نورالحسین کی افسانہ نگاری پر صادق نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے پلاٹ دیہی اور شہری حدود سے نکل کر بین الاقوامی سرحدوں تک کو عبور کر گئے۔ گڑھی میں اُترتی شام زوال حیدر آباد کے بعد ایک دیہات کے ایک زمیندار کی کہانی ہے۔ افسانہ 'کلمہ گو' کا پس منظر حیدر آباد دکن ہے۔ افسانہ 'پیپل کی چھائیاں' شہر پونا سے تعلق رکھتا ہے۔ افسانہ 'یہ تیرے پُر اسرار بندے' کا Scenario ممبئی شہر کا ہے۔ 'یہ عشق نہیں آساں' کا شہر اورنگ آباد ہے۔ افسانہ 'بھور بھئی جا گو' میں ریاست کیرالہ کا ایک مقام اندلور ہے۔ افسانہ 'سبز نورستہ کا نوحہ' کا مرکزی کردار حیدر آباد کا ہے جو کراچی پہنچ کر مہاجر بن جاتا ہے۔ افسانہ 'آخری اسٹوری' عراق کے زوال کے پس منظر میں ہے اور افسانہ 'بسلامت روی و باز آئی' افغانستان کے اطراف گردش کرتا ہے۔ نورالحسنین کے تحت الشعور میں کربلا بھی بسی ہوئی ہے۔ ان کے افسانے 'سبز نورستہ کا نوحہ' میں کربلائی منظر نامہ ہے۔ افسانے کا کردار اپنے گھر اور محبوبہ سکینہ کو چھوڑ کر پاکستان ہجرت کر جاتا ہے۔ پچاس برس کے بعد جب وہ واپس آتا ہے تو دیکھتا ہے کہ جہاں اُس کا گھر تھا، وہاں ایک بلڈنگ کھڑی ہے۔ اُس کے قریب عاشور خانہ ہے۔ جہاں محرم کی مجلس ہو رہی ہے۔ افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے کہ واقعہ کربلا کس طرح کسی کا ذاتی غم بن جاتا ہے:

> ''میرے کانوں میں آوازیں گونج رہی تھیں، 'ہائے امامِ مظلوم آپ کے عزیز اور چہیتے باقی نہ رہے، ہائے امامِ مظلوم آپ سے آپ کا مدینہ چھوٹ گیا، ہائے امامِ مظلوم آپ کی سکینہ بے سہارا ہو گئی، ہائے امامِ مظلوم آپ کا

سب کچھ چھوٹ گیا، ہائے امامِ مظلوم آپ کس کس پر صبر کریں گے؟ میں غم سے نڈھال بہت دیر تک سکتے کی حالت میں ڈوبا رہا اور پھر بوجھل قدموں سے چلتا ہوا جیسے ہی امام باڑے میں داخل ہوا، وہاں ماتم اپنے نقطہ عروج پر تھا۔ سینے پر پڑنے والی ہر ضرب اور منہ سے نکلنے والی ہر آواز 'تشنہ شد یا حسین' راست میرے دل پر بجلی بن کر گر رہی تھی۔ ماتم داروں میں، میں بھی شامل ہو گیا۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہو رہی تھی اور میری زبان سے پورے کرب کے ساتھ آوازیں نکل رہی تھیں 'ہائے تشنہ شد یا حسین'۔ 'ہائے تشنہ شد یا حسین'۔ 'ہائے تشنہ شد یا حسین'۔ (سبز نورستہ کا نوحہ۔ از نور الحسنین)

ان کے افسانوں کے چار مجموعے 'سمٹتے دائرے'، 'مور رقص اور تماشائی'، 'گڑھی میں اُترتی شام'، 'فقط بیان تک' اور 'بھور بھئی جاگو' چار ناول 'اہنکار'، 'ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'، 'چاند ہم سے باتیں کرتا ہے' اور 'تلک الایام' کے علاوہ تنقیدی کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ 1980 کے بعد اُبھرنے والے افسانہ نگاروں پر مضامین کے مجموعے 'نیا افسانہ۔ نئے نام' کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ نور الحسنین کی افسانہ نگاری ذکر کرتے ہوئے عصمت جاوید ایک جگہ پر لکھتے ہیں:

''افسانے کی دنیا میں نور الحسنین کا نام بالکل نیا ہے۔ ''بساط ہوائے دل'' پر وہ ابھی تازہ وارد ہیں۔ وہ مہاراشٹرا کے مشہور ادبی خطے مراٹھواڑہ میں ریڈیو آرٹسٹ کی حیثیت سے اور اسٹیج پر بھی اپنی صلاحیتوں کا سامعین اور ناظرین سے اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔''

(افسانوی مجموعہ 'سمٹے دائرے' نور الحسنین۔ پیش لفظ۔ عصمت جاوید ص ۸)۔

اس مجموعے کا پہلا افسانہ ہی قاری کے دل کو متاثر کر دیتا ہے جس کے بعد سے افسانہ نگار کی ساری گرہیں کھلتی ہوئی نظر آنے لگتی ہیں۔ عہد جدید کی مشہور و معروف شخصیتوں میں اہم نام نور الحسنین کا لیا جاتا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کے تعلق سے عصمت جاوید لکھتے ہیں کہ:

''پریم چند کے اردو افسانے نے مختلف جہتوں میں سفر کیا ہے۔ منٹو کی

فنکارانہ جنس پرستی سے لے کر علامتی اور تجریدی افسانوں کے کچھ انتہائی معنی خیز اور اکثر لایعنی فنی تجربوں تک اس نے ہزار رنگ اختیار کیے ہیں۔ نورالحسنین کے افسانوں میں بھی اس بت ہزار شیوہ کی ایک انوکھی ادا کی ہلکی سی جھلک دیکھی جاسکتی ہے''

(افسانوی مجموعہ 'سمٹے دائرے' نورالحسنین۔پیش لفظ۔عصمت جاوید ص ۸)۔

سمٹے دائرے کے تمام افسانے تخیلی علامتی نہیں ہیں۔''واپسی'' کا پروفیسر ایک مثالی کردار ہے''مٹی'' کا بنیادی موضوع وہی ہے، لیکن انداز پیشکش نے اسے بالکل جداگانہ روپ دے دیا ہے۔ بچے کا بار بار منہ میں ڈھیلا رکھنا علامتی ٹچ ہے۔اس مجموعے میں کچھ افسانے ایسے ہیں جو آپ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیں گے۔عصمت جاوید لکھتے ہیں:

''نورالحسنین کے افسانوں میں ایک خاص بات مجھے یہ نظر آتی ہے کہ وہ پامال موضوعات سے گریز کرتے ہیں۔وہ اسی وقت قلم اٹھاتے ہیں جب وہ کسی انوکھے تجربے سے گذرتے ہیں اور اسے انوکھے انداز میں پیش کرتے ہیں۔یہی چیز انھیں عام رومانوی افسانہ نگاروں سے منفرد کرتی ہے۔ان کا اسلوب بیجا مرصع کاری اور ضرورت سے زیادہ سادہ بیانی، دونوں عیوب سے پاک ہے۔''

(افسانوی مجموعہ 'سمٹے دائرے' نورالحسنین۔پیش لفظ۔عصمت جاوید ص ۹)۔

سورج سوا نیزے پر' اس افسانے میں نورالحسنین کی مکالمہ نگاری عروج پر نظر آتی ہے۔ فضابندی اور تخیل سازی کی کامیاب کوشش ہے اور مخصوص تقلیبی اور معکوسی تکنیک کی عمدہ مثال ہے۔یہی تخیل سازی اور خیالی ماحول در پردہ آثار کی روشنی میں''آخری اسٹوری'' کو قابل ذکر بناتا ہے اور سردار کا کردار قدر کی جبر میں تبدیلی کر دیتا ہے۔اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ نورالحسنین مکالمہ لکھنا عمدہ طریقے سے جانتے ہیں۔ ناصر جاوید ان کی افسانہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''نورالحسنین کی تقلیبی اور معکوسی تکنیک''شہر خموشاں کا نقیب'' کو بھی قابل مطالعہ بناتی ہے۔گورکن کے وجود کو نفرتوں سے، ذلتوں سے،

غلاظتوں سے چھڑا کر ایک قابل رحم لائق مطالعہ کرنے میں تبدیل کر دیتی ہے۔ رہا بافت کا مسئلہ تو وہ چست ہے اور زبان واحد متکلم ہو کر کرداروں کا ساتھ دیتی ہے، یہی چیز نورالحسنین کی شناخت بنتی ہے۔ کہانی کا غائب کردار اپنے انجام کے تعاقب میں ہے لیکن کہانی اپنے اختتامیہ میں برعکس صورت حال کو پیش کرتی ہے۔ جس کہانی نے سب سے زیادہ مجھے متاثر کیا ہے وہ ہے گڑھی میں اتری شام''

(افسانوی مجموعہ گڑھی میں اتری شام۔ پیش لفظ ناصر جاوید۔ ص ۹)

نورالحسنین کے افسانوں میں کہیں نہ کہیں مقامیت، علاقائیت اور ارضیت کی مثال ضرور ملتی ہے، جو اپنے آپ میں آفاق ہیں۔ ان کی مکالمہ نگاری اپنے مناسب سمتوں میں رواں دواں ہے۔ اکثر مکالمے کردار کی مناسبت سے ہوا کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں کہانی بھی ہے، تام جھام ہے، چہل پہل ہے، سرگوشیاں بھی ہیں، شور بھی ہے سناٹے بھی ہیں نیند بھی ہے اور بیداری بھی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ایک آباد دنیا کی آباد کہانیاں ہیں۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جن کی بنیاد پر نورالحسنین اپنے معاصر افسانہ نگاروں میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔

حواشی:

☆ ('افسانے کا ارتقاء ہر لحاظ سے ہوا ہے' انٹرویو۔ ڈاکٹر غضنفر 51 2022)

☆ (سبز نورستہ کا نوحہ۔ از نورالحسنین)

☆ (افسانوی مجموعہ 'سمٹے دائرے' نورالحسین۔ پیش لفظ۔ عصمت جاوید ص ۸)۔

☆ (افسانوی مجموعہ 'سمٹے دائرے' نورالحسین۔ پیش لفظ۔ عصمت جاوید ص ۸)۔

☆ (افسانوی مجموعہ گڑھی میں اتری شام۔ پیش لفظ ناصر جاوید۔ ص ۹)

❖❖❖

Ibraheem Azmi
Mahi Score Library
Buland Bagh, Near City Station
Lucknow-226018
MOb. 9036744140

ڈاکٹر جہاں گیر حسن
کوشامبی

اعظم کُریوی: حیات اور شخصیت

اصل نام انصار احمد اور قلمی نام اعظم کُریوی ہے۔ اِس میں ’اعظم‘ تخلص اور ’کُریوی‘ آبائی گاوں ’کُرئی‘ کی طرف منسوب ہے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ اُستاذ نوح ناروی نے اُن سے پوچھا: اعظم! یہ تم اپنے نام کے ساتھ ’’کُریوی‘‘ کیوں لکھتے ہو؟ اعظم کُریوی نے جواب دیا: اُستاذ! بالکل اُسی طرح جیسے آپ اپنے قصبے ’نارہ‘ کی مناسبت سے ’ناروی‘ لکھتے ہیں۔ اُستاذ! ایک دن آئے گا جب ’کُرئی‘ دور-دور تک مشہور ہوگا۔ اُن کی یہ پیشین گوئی صد فیصد دُرست ثابت ہوئی کہ آج ’اعظم کُریوی‘ ایک دمدار ستارے کی مانند فکشن کی دنیا میں چمک دمک رہے ہیں۔

تاریخ پیدائش: اعظم کُریوی 1899ء میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن کورئی ہے جو پرگنہ (تحصیل) چائل، ضلع الہ آباد، اترپردیش میں واقع ہے۔ کورئی، بوڑھی گنگا کے کنارے ایک خوب صورت گھاٹ تھا جہاں بمشکل ساٹھ (60) گھر بستے تھے۔ آج بھی یہ گاؤں، بوڑھی گنگا کے کنارے واقع ہے۔ البتہ تعلیم و تعلّم کے اعتبار سے آج کل اِس گاؤں کی حیثیت پہلے جیسی نہیں رہی۔ ماہنامہ ’’اخبار اعظم، اعظم نمبر‘‘ میں 22 جون 1898ء سال و تاریخ پیدائش ہے اور مدت ملازمت میں دو سال کی توسیع کے لیے جس سرٹیفکیٹ کو درخواست کے ساتھ منسلک کیا تھا اُس میں 16 دسمبر 1901ء مندرج ہے۔ اِس لحاظ سے دیکھا جائے تو تاریخ و

سال کے سلسلے میں حتمی طور پر کچھ کہنا بڑا مشکل ہے۔لیکن چوں کہ اعظم کُریوی نے بذات خود اپنا سال پیدائش 1899ء درج کیا ہے، لہٰذا ہمارے نزدیک یہی زیادہ قرین قیاس اور درست معلوم ہوتا ہے۔بایں سبب 1899ء کو ہی ہم نے لائق اعتبار اور درست تسلیم کیا ہے۔

آبا واَجداد کے نام: 'فیاض احمد' والدمکرم ہیں۔ 'قادر بخش' جدامجد ہیں۔جبکہ اسرار اَحمد اور محمد احمد دونوں بالترتیب چھوٹے بھائی ہیں۔اعظم کُریوی اُن میں سب سے بڑے ہیں۔ 1947ء سانحے کے شکار اعظم کُریوی بھی ہوئے اور باوجودیکہ والدین سے بڑی محبت کرتے تھے برادراوسط اَسرار احمد کے ساتھ پاکستان ہجرت کر گئے۔اس کے برعکس والدمکرم فیاض احمد اَور برادراصغر محمد احمد نے ہندوستان میں رہنا پسند کیا۔اِس طرح اُنھیں دو سانحوں سے دوچار ہونا۔ایک والدین کے سایۂ عاطفت سے محرومی اور ایک آبائی وطن کی دردناک جدائی۔اعظم کُریوی کو وَالدین کریمین سے کس قدر محبت تھی، اس کا اندازہ اِس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب بھی اُس کے پاس والدین کا کوئی خط آتا، تو وہ اُسے پڑھنے کے بعد اَپنے بچوں کو دیتے اور کہتے: بیٹا! ''اِسے چومو، یہ تمہارے دادا-دَادی کا خط ہے۔''اعظم کُریوی اپنی اولاد کو برابر کہتے رہتے تھے کہ''میرا کہا بیشک ایک دفعہ ٹال جانا مگر ماں کو کچھ نہ کہنا۔''اعظم اپنے ماں-باپ سے متعلق بہت ہی Touchy واقع ہوئے تھے۔وہ سب کچھ سن لیتے تھے اور برادشت بھی کر لیتے تھے لیکن اپنی ماں کے بارے میں بالخصوص وہ کچھ نہیں سن سکتے تھے۔

خاندانی نسب نامہ: مشربی سلاسل میں قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ کی طرح سہروردیہ ایک اہم سلسلہ ہے۔اس کے بانی عارف باللہ شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ ہیں۔اِس خاندان کے مورث اعلیٰ شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی کا مزار مبارک ملتان (پاکستان) میں زیارت گاہِ ہر خاص وعام ہے۔اعظم کُریوی کا تعلق اسی خانوادہ سے ہے۔

عہد طفولیت اور پرورش: اعظم کُریوی کے والد فیاض احمد علاقے کے بڑے زمیندار تھے

اِس لیے اُن کا بچپن بڑی خوش حالی اور بے فکری میں بسر ہوا۔ چوں کہ کورئی کے ایک طرف دریائے گنگا واقع تھا اور ایک طرف کھیت۔کھلیان کی صاف وشفاف اورسرسبز فضائیں، اِس لیے اعظم کُریوی نے سیپیاں چننے کا بھی لطف اُٹھایا اور سیر وتفریح اور اُچھلنے کودنے کا بھی مزہ لیا۔ شاید اِسی خوشحالی اور بے فکری نے اُن کی طبیعت میں صفت ضد کا عنصر غالب کردیا تھا۔ کیوں کہ اُن کے والد فیاض احمد جب کہیں باہر جاتے تو اعظم کُریوی زبردست چیخ وپکار مچاتے اور زمین لوٹ لوٹ جاتے کہ ہم بھی ہمراہ چلیں گے۔ چناں چہ انھوں نے اس کا یہ حل نکالا کہ کہیں جانے سے دو تین گھنٹے پہلے باغ میں گھوڑی، کاٹھی اور چارہ وغیرہ بھیجوادیا کرتے تاکہ اعظم کو اُن کے نکلنے کا پتا نہ چل سکے۔

حصول تعلیم: چوں کہ گھرانا شریف ونجیب اور تعلیم یافتہ تھا اِس لیے اعظم کریوی کی تعلیم و تربیت پر بھی خصوصی توجہ دی گئی۔ تعلیم کی ابتدا گاؤں ہی سے ہوئی اور پھر مزید تعلیم کے لیے شہر کا رُخ کرنا پڑا۔ لہٰذا حصول تعلیم کی غرض سے اپنے ماموں احتشام الدین کے پاس جو سہارن پور گئیجہاں وہ پولیس انسپکٹر کی حیثیت سے تعینات تھے، وہاں اعظم کا داخلہ ایک اسکول میں کرایا گیا۔ اِسی درمیان چندن نامی ایک پنڈت لڑکی سے محبت کا رشتہ اُستوار ہوگیا۔ جب اس کا شہرہ اہل خانہ تک پہنچا تو چندن کا اسکول جانا بند ہوگیا اور اِس کے باعث ماموں کی طرف سے اعظم کو بھی بہت کچھ سخت وسست سننا پڑا۔ کچھ عرصہ بعد اِحتشام الدین کا تبادلہ علی گڑھ ہوگیا تو اَعظم بھی اپنے ماموں کے ساتھ علی گڑھ پہنچ گئے۔ لیکن ابھی چند ہی دن ہوئے تھے کہ الہ آباد لوٹ گئے اور آگے کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اعظم کا داخلہ بورڈنگ اسکول میں کرادیا گیا۔ الہ آباد ہی میں انٹر پاس کیا اور ایف. اے میں داخلہ لیا لیکن ابھی ایف. اے کورس کا دوسرا سال ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ تعلیمی سلسلہ منقطع ہوگیا اور ملازمت کی طرف مائل ہوگئے۔

عہد ملازمت: آثار وقرائن بتاتے ہیں کہ اعظم کریوی نے اپنی ملازمت کا آغاز کلرک سے کیا۔ اولین دفعہ وہ سہارن پور کے ایک سرکاری دفتر میں بحیثیت کلرک ملازم ہوئے۔ یہاں ایک

بار پھر چندن سے ملاقات ہوئی اور پُرانی یادیں تازہ کیا ہوئیں کہ محبت آمیز خط و کتابت کا دور شروع ہوگیا۔لیکن جب اِس معاشقے کی بات چندن کے قریبی رشتے داروں تک پہنچی تو وہ اعظم کے جانی دشمن ہوگئے۔ 1916ء میں میرٹھ چلے گئے اور 1920ء تک وہاں قیام پذیر رہے اور میرٹھ سے ہی سال 1919ء میں اُن کے رومانی خطوط پر مشتمل ایک مجموعہ ''پریم پتر'' کے نام سے شائع ہوا۔ اِس کے بعد الہ آباد واپسی ہوئی اور یکم ستمبر 1921ء کو الہ آباد کے ایک فوجی ادارے میں عارضی سویلین کلرک کے طور پر بحال ہوئے۔ 18 مئی 1922ء کو مستقل کلرک بنائے گئے اور 18 اکتوبر 1926ء تک الہ آباد میں ہی رہے۔

یہی وہ زمانہ ہے کہ اعظم کریوی 'ماہنامہ طوفان' الہ آباد کے ادارتی بورڈ سے منسلک ہوئے اور نوح ناروی کی سرپرستی میں نکلنے والے اِس ماہنامے کے مدیر قرار پائے اور اِسی میں اُن کا پہلا افسانہ ''پریم کی انگوٹھی'' شائع ہوا۔ الہ آباد سے تبادلہ ہوا تو کوئٹہ چلے گئے اور 19 اکتوبر 1926ء سے 19 اکتوبر 1928ء تقریباً دو سال تک جبل پور میں تعینات رہے۔ اِس کے بعد بھی مختلف مقامات پر تبادلہ ہوتا رہا۔لیکن ایک بار پھر میرٹھ جا پہنچے اور 12 اپریل 1941ء سے 22 دسمبر 1942ء تک ہیڈ کوارٹر میرٹھ ڈسٹرکٹ کے ویٹری برانچ کے سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر مامور ہوئے اور اِس درمیان کچھ دنوں کے لیے ''دہرہ دون'' میں بھی تعینات رہے۔ اعظم کریوی کے لیے 1928-1942ء کا زمانہ تحریر و تالیف کے لحاظ سے بڑا زرخیز معلوم ہوتا ہے، مثلاً: زمانہ، نگار، الناظر، عصمت، مخزن، ہمایوں وغیرہ مشہور و معروف رسائل میں اعظم کے افسانے شائع ہوئے۔ اُن کی مختلف کتابیں منظر عام آتی ہیں، مثلاً: ایک کتاب 'ہندی شاعری' 1931ء میں کتابستان، الہ آباد سے شائع ہوئی اور ایک کتاب ''دیہاتی گیت'' 1939ء میں ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد سے شائع کی گئی۔ جبکہ اُن کا اولین افسانوی مجموعہ ''پریم کی چوڑیاں'' 1942ء میں شائع

> ”دکھیا کی کہانی میری زبانی کے عنوان سے ایک سلسلہ وار کہانی ماہنامہ ''عصمت'' کراچی کیلئے شروع کی تھی لیکن زندگی نے وفا نہیں کی“

ہوا۔ اِس زمانے میں اعظم کریوی رسالہ ''اکبر'' کے شعبۂ ادارت سے بھی منسلک رہے۔

اس کے بعد سال 1942-1943ء میں چھ-سات مہینے کے لیے بنگال میں تعینات رہے، پھر اَنبالہ چلے گئے اور 1943ء سے 23 نومبر 1947ء تک انبالہ/سباتھو میں رہے۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ کافی جدوجہد اور عمل پیہم کے بعد ہندوستان کو آزادی ملی اور تشکیل پاکستان عمل میں آئی۔

1924-1947ء کا عہد افسانہ نگاری کے اعتبار سے انقلابی ثابت ہوا۔ اِس دوران ان کے تقریباً چھ افسانوی مجموعے منظر عام آئے۔ مثال کے طور پر ''شیخ و برہمن'' اور ''دکھ سکھ'' یہ دونوں مجموعے 1943ء میں، ''انقلاب'' اور ''کنول'' یہ دونوں مجموعے 1944ء میں، ''ہندوستانی افسانے'' اور ''روپ سنگھار'' یہ دونوں مجموعے 1945ء میں یکے بعد دیگرے شائع ہوئے۔

تقسیم ہند کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے، وہیں سرگودھا میں ملازم بحال ہوئے۔ پاکستان ہجرت کر جانے کے بعد اعظم کریوی کی افسانہ نگاری میں کمی آ گئی تھی اور فقط چند گنے چنے افسانے ہی لکھ پائے۔ اُن میں ایک افسانہ ''مہاجر کی عید'' اور ایک کہانی کا سلسلہ ''دکھیا کی کہانی میری زبانی'' قابل ذکر ہے۔ ''دکھیا کی کہانی میری زبانی'' کے عنوان سے سلسلہ وار کہانی ماہنامہ ''عصمت'' کراچی کیلئے شروع کی تھی لیکن زندگی نے وفا نہیں کی اور مذکورہ کہانی کا یہ سلسلہ پانچ کے عدد پر ہی رُک گیا، جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

وفات: اعظم کُریوی نے یکے بعد دیگرے چار شادیاں کیں۔ اعظم کریوی جو کبھی انتہائی عیش و عشرت کی زندگی بسر چکے تھے آخری عمر میں اُنھیں کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اُن کی پیشانی ذرہ برابر بھی شکن آلود نہیں ہوئی۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ایک بار پھر کہانی لکھنے کی طرف مائل ہوئے اور سچی کہانی پر مشتمل سلسلہ 'دکھیا کی کہانی' کے نام شروع کیا اور ابھی اُس کے غالباً چار پانچ سلسلے ہی شائع ہوئے تھے کہ اُسی کہانی کے سبب جان لیوا حملہ ہوا اور 1955ء میں اس دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔

شخص وعکس: اعظم کریوی کے اوراق حیات پلٹنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اعظم کی شخصیت تضادات کا مجموعہ ہے۔ ایک طرف احباب و متعلقین اُنھیں تیز مزاج، غصیلے، کھردری طبیعت کا مالک بتاتے ہیں تو دوسری طرف اصدقا اُنھیں نازک مزاج، زندہ دل، بذلہ سنج، ہمدرد اور دوست نواز شخصیت کہتے ہیں۔ برادر اوسط اسرار احمد کریوی اپنے مضمون ''ذکر اعظم کریوی'' میں لکھتے ہیں کہ ضدی طبیعت پائی تھی اور تیز غصہ والے تھے۔ یہاں تک کہ اپنے غصے کی تیزی کے باعث انگریز وغیرہ کو گالی دینے اور انگریز افسروں کو پیٹنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ بایں سبب وہ ترقی نہ کر سکے جب کہ اعظم کے ساتھی نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ فوج میں اُن کی ترقی نہ ہونے کی وجہ صرف اُن کا غصہ تھا۔ اس کے برعکس ایک مراسلہ جو اعظم کریوی نے 1934ء کے اخیر میں ''نیرنگ خیال'' لاہور کے ایڈیٹر کو لکھا تھا اُس کے بموجب: اعظم بڑے نازک مزاج اور جذباتی معلوم ہوتے ہیں۔ مراسلہ میں درج ہے کہ شور وغل سے بہت گھبراتا ہوں۔ دل پر کسی خاص واقعہ یا نظارہ کا اثر ہوا کہ میں تنہائی میں افسانہ لکھنے بیٹھ جاتا ہوں، اس عالم میں اگر میرے کسی کرم فرمانے پکارا، یا میرے بچوں نے شور مچایا تو پھر لاکھ کوشش کرنے پر بھی اس وقت اپنے افسانے کو مکمل نہیں کر سکتا۔ چناں چہ اس نقص کی وجہ سے سال میں دو چار ہی اوریجنل افسانے لکھ پاتا ہوں۔

اعظم کُریوی اپنے والدین کے بڑے چہیتے، لاڈلے اور پیارے تھے، اور اِس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اِس سے پیشتر فیاض احمد کی جو بھی اولاد ہوئیں وہ زندہ نہیں رہ سکیں۔ وہ اقربا پروری اور انسان دوستی کی مثال تھے۔ اپنے عزیز و اقارب سے اُنھیں بڑی محبت تھی۔ گاؤں کے غرباء سے خلوص کے ساتھ ملتے تھے اور لوگوں سے بلا تفریق ذات، برادری و مذہب بڑی عزت کرتے تھے۔ لیکن اُن کی شخصیت کا یہ پہلو بڑا ہی حیرت انگیز ہے کہ وہ اپنے اعزہ و اقارب کی عزت کرنے اور اُن سے حد درجہ محبت رکھنے کے باوجود اپنے بیٹوں کو رِشتے داروں سے دوری بنائے رکھنے کی تاکید و تلقین کرتے تھے۔ بقول افتخار احمد: والد صاحب مجھ کو سمجھاتے تھے کہ رشتے داروں سے اور خاندان والوں سے کوئی تعلق نہ رکھنا، خاندان میں

رشتہ دینا نہ رشتہ لینا۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ وہ دادا کے علاوہ کسی سے نہیں ملاتے تھے اور اِس کی خاص وجہ یہ تھی کہ اعظم کریوی اپنے خاندان والوں سے اُن کی بعض غلط حرکات کے باعث بدظن تھے، کیوں کہ والد صاحب کا کہنا تھا کہ رشتے دار دھوکے باز ہیں۔ اُنھوں نے جعلی شجرے بنائے۔ یہ اپنے کو مقید کرنا ہے اور یہ اسلامی تعلیمات کے بھی خلاف ہے، لیکن اِن سب باتوں کے باوجود خاندان کے بڑوں کی عزت اور اُن سے محبت رکھنے پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی وہ اپنے خاندان کے بڑوں کی عزت اور اُن سے محبت کرتے رہے۔ پھر رہ گئی یہ بات کہ اپنے بچوں کو اُن سے دوری بنائے رکھنے کی تاکید و تلقین کی تو میرے خیال میں اس کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

1- اہل خاندان کی غلط حرکتوں کے سبب اُن کے بچوں کو کوئی نقصان نہ ہو۔ 2۔ اُن کے بچے خاندان والوں کی بے عزتی نہ کردیں۔ 3۔ یا وہ رسم ورواج توڑنا چاہتے تھے جو خاندان والوں نے اپنا رکھا تھا کہ شادی بیاہ خاندان سے باہر نہیں ہونی چاہیے۔ کیوں کہ وہ خاندانی حد بندیوں پر یقین نہیں رکھتے تھے، اُنھوں نے بعد میں جو تین شادیاں کیں وہ بھی خاندان سے باہر ہی کی تھیں۔

جناب ضمیر جعفری جو 1953ء میں ''مورال بلڈنگ محکمے'' کے تحت ملازمت کے دوران ساتھ رہے، وہ ڈاکٹر اعظم کُریوی سے بہت متاثر تھے اور اُن کی پُر کشش اور اِنسان دوست شخصیت سے کافی مرعوب و متحیر بھی تھے۔ اپنے مضمون ''ڈاکٹر اعظم کُریوی کے ساتھ دوسال'' میں وہ لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر اعظم کریوی کی شخصیت اور کردار کو اگر ایک لفظ میں بیان کرنا چاہوں تو وہ لفظ ہے ''حیرت انگیز''۔ کیوں کہ اُن کی زندگی کا جو بھی گوشہ سامنے آیا اُسے حیرت انگیز پایا۔ 1951ء میں ملیر کینٹ کے محکمہ ''مورال بلڈنگ'' میں اُن کا تقرر ہوا تو حفیظ جالندھری کے توسط سے اُنھیں پہلی بار دیکھنے کی مسرت حاصل ہوئی۔ دفتر میں تو دونوں ساتھ ساتھ رہتے ہی تھے، رہائش بھی پاس پاس ہونے کی وجہ سے جلد ہی ہم دونوں میں کافی اخلاص پیدا ہوگیا۔ دفتر اور گھر قریب قریب تھا اِس لیے بسا اوقات ہم لوگ شام کا کھانا بھی

دفتر ہی میں منگوالیا کرتے تھے۔محکمانہ تعلقات بہت جلد دوستانہ محبت میں ڈھل گئے۔ہم لوگ کسی مشترکہ دفتر کے کارکنان سے زیادہ دکھ سکھ کے شریک اورایک کنبے کے افرادمعلوم ہوتے تھے۔دفتر سے اُٹھتے تو حفیظ جالندھری کے یہاں جابیٹھتےاورظاہرسی بات ہے کہ اس حالت وکیفیت میں ڈاکٹر صاحب سے بے تکلف ہوئے بغیر میرے لیے کوئی چارہ نہ تھا۔اگرکبھی عمرمیں فرق کے باعث میں کچھ فاصلہ قائم کرنے کی کوشش بھی کرتا تو وہ آگے بڑھ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیتے۔حجاب وتکلف کے وہ سخت مخالف تھے۔دفتر میں مجھ سے پہلے ہی روز کہنے لگے کہ میں تو آپ کو بھائی کہا کروں گااور فی الحقیقت میرے ساتھ اُن کا سلوک ہمیشہ بڑے بھائی کا سا رہا۔

اعظم کُریوی کے مزاج وشخصیت سے متعلق اپنے ایک مکتوب بنام حامدکمال ناروی میں ضمیر جعفری لکھتے ہیں کہ میں نے اپنی زندگی میں دو بیویوں والے کو اِتنابذلہ گفتاراور اِتنا بےفکرا کسی کواَور کبھی نہیں دیکھا۔شاہداحمد دہلوی اپنا مجموعی تاثریوں دیتے ہیں کہ اعظم کریوی ایک عجیب وغریب انسان تھے۔

اعظم کریوی نے کچھ دنوں تک لکھنومیں بھی قیام کیا جہاں اُن کی ملاقات ڈاکٹرعبادت بریلوی سے ہوئی۔ اِس ملاقات میں اُنھوں نے اُن کو کیسا پایا، اپنے ایک مکتوب بنام حامدکمال ناروی میں لکھتے ہیں کہ ڈاکٹراعظم کریوی کے بارے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ایک زمانے میں لکھنؤ تشریف لائے تھےاور چند ماہ اُن کے ساتھ میں نے گزارےلیکن ان کی شخصیت بہت عجیب تھی،اتنی عجیب کہ میں ان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔اُن سے میری ملاقاتیں رہیں لیکن اب میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیسے آدمی تھے۔میں نے ہمیشہ اُنھیں اچھا دوست پایا۔دانش محل میں روزانہ تشریف لاتے تھے اوراُن سے روزانہ ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ڈاکٹراعظم کُریوی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی نہایت محنت،مستعدی اورایمانداری سے اپنی ذمے داری ادا کرتے تھے۔مختلف النوع مصائب ومسائل میں گھرے ہونے کے باوجوداُنھوں نے کبھی بھی اپنے فرائض منصبی سے

سمجھوتہ نہیں کیا اور نہ اپنے معمولات میں کبھی کوئی رُکاوٹ آنے دی۔ ریٹائر ہونے سے چند سال پہلے اخراجات کی کثرت اور وسائل کی کمی سے ہجوم افکار نے اعظم کریوی کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ وہ پہلے کی طرح اب تنومند تو نہیں تھے لیکن ان کے حوصلے پوری طرح پست نہیں ہو سکے تھے اور اُن کی فرض شناسی اور فرض کی ادائیگی متاثر نہیں ہو سکی تھی۔ معمولات کے اتنے بڑے پابند تھے کہ ایسے انسان میں نے اپنی زندگی میں بہت کم دیکھے ہیں۔ احساس فرض کا جذبہ اس قدر شدید تھا کہ ان کی زندگی ایک سزا با مشقت معلوم ہوتی۔ پاسبان عقل ہر وقت دل پر مسلط۔ 1951ء میں وہ پنشن کی حد پر جا پہنچے تھے۔ زندگی کچھ اس بیدردی سے ان کے اوپر سے گزری تھی کہ وہ اپنی عمر سے بھی کوئی پندرہ برس زیادہ معمر نظر آتے تھے۔ رخسار پچک گئے تھے۔ ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ دبلے پتلے، لاغر و کمزور، آنکھیں اندر کو کہیں اتنی دور چلی گئی تھیں کہ چہرے پر ناک ہی ناک رہ گئی تھی۔ مگر اس کے باوجود بلا کے مستعد تھے۔ غضب کے چوکس و چوبند اور کارفرما و کارکشا۔ دیکھنے میں وہ تکان کا مجسمہ دکھائی دیتے تھے مگر تھکنا وہ جانتے ہی نہ تھے۔ وہ اس مقام پر تھے جہاں تکان خود تھک کر بیٹھ جاتی ہے۔ اُن کی گھریلو زندگی کا پھیلاؤ اُن کے وسائل و آمدنی کے بس کا روگ نہ تھا۔ معاملات الجھے ہوئے بھی تھے مگر یہ ناممکن تھا کہ محض ان کی کاہلی یا بے پروائی کے سبب کوئی معاملہ اُلجھنے پائے یا دیر تک الجھا رہے۔ جس وقت اُن کو جس مقام پر ہونا چاہیے وہ وہاں ضرور ہوتے۔ اور ایسے عالم میں اگر اُن کا کوئی سچا ہمدرد و غمگسار تھا تو وہ تھی اُن کی بوسیدہ سی بائیسکل، جو زندگی کی تمام مشکلات میں اُن کے ساتھ ساتھ رہی اور تمام طرح کے فرائض منصبی کی ادائیگی میں اُن کی مدد کرتی رہی۔ اپنی تمام تر ذمے داریاں اور گھریلو کام کاج اسی بائیسکل پر سرانجام دیتے تھے اور بائیسکل بھی اسی طرح چلاتے تھے جیسے کوئی بیمار گھوڑ الدا ہوا تانگہ گھسیٹ رہا ہو۔

گویا اعظم کُریوی کی حیات کا ابتدائی دور جس قدر آسودہ حالی میں بسر ہوا، اس کے برعکس اُن کی زندگی کا آخری دور کسمپرسی اور تنگ حالی میں گزرا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے بچپنے میں گھوڑی اور کاٹھی کی شاہی سواری کا لطف اُٹھایا تو ضعیفی

میں اُنھیں ٹوٹی پھوٹی اور کھٹارا بائیسکل کی رفاقت برداشت کرنی پڑی۔ وہ خود کو مصروف رکھنے میں یقین رکھتے تھے اور خالی بیٹھنا اُنھیں سخت ناگوار تھا۔ بقول ضمیر جعفری 'ملیر سے ڈیوٹی ٹرک لے کر ہم لوگ جب کبھی کراچی جاتے تو اعظم اپنی بائیسکل بھی اُسی میں رکھ لیتے، جہاں ٹرک نہ جاسکتا وہاں وہ بائیسکل پر ہو آتے۔ بازار میں اچھے بھلے چلتے چلتے اچانک معذرت کر کے یکبارگی غائب ہو جاتے۔ پھر اللہ معلوم کہاں کا چکر کاٹ کر اچانک کسی موڑ پر آن ملتے۔ گویا ابھی تھے ابھی نہیں ہیں۔ آرام اُن کی سرشت ہی میں نہ تھا۔ دوستوں کی بے تکلف صحبتوں میں ان کی گفتگو پر بھی مشقت کا گمان ہوتا۔ اعظم کو میں نے آرام سے فارغ بیٹھا کبھی نہ دیکھا۔ بعض اوقات گمان ہوتا کہ فارغ بیٹھنے سے اُنھیں شدید تکلیف ہوتی تھی۔ دفتر تو خیر دفتر تھا، گھر پر بھی جب ملے تو ہمیشہ مصروف ملے، کبھی چارپائی کا بان ادھیڑ رکھا ہے۔ کبھی دھوتی باندھے گھر کی صفائی میں جٹے ہیں۔ کبھی نواسے، نواسوں کے حلقے میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ کچھ نہیں کر رہے ہیں تو بائیسکل پر چڑھے کسی طرف ہی چلے جا رہے ہیں۔' اُن کے پاس گھریلو ذمہ داریوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی ایک لمبی لسٹ ہوتی تھی اور کب کیا انجام دینا ہے وہ سب اُن کی ٹیبل ڈائری میں مندرج رہا کرتے تھے۔ پھر بھی وہ بڑے اطمینان وسکون سے اپنے کام میں مصروف رہتے اور بڑی سے بڑی ذمہ داری کو بھی اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیتے۔ گویا اعظم کُریوی کی شخصیت ایک ایسے مضبوط مجسمے کی طرح تھی جو بادِ باراں کی تند یورشوں کو خاطر میں نہیں لاتی اور اپنی جگہ اٹل رہتی ہے۔

بحیثیت سوشل ورکر: چوں کہ اعظم کُریوی کا آخری زمانہ کسمپرسی اور کلفت میں گزرا اِس لیے وہ سامنے والے کا دکھ درد بخوبی سمجھتے تھے۔ بنا بریں دوسروں کے دکھ- درد میں کام آنا وہ اپنا فرض منصبی جانتے تھے، اور پیرانہ سالی میں لوگ عام طور پر آرام طلب واقع ہوتے ہیں بلکہ ایک گلاس پانی کے لیے بھی کسی نہ کسی کی مدد کے طالب ہوتے ہیں، لیکن اعظم کی شخصیت اِس اعتبار سے منفرد اور قابل رشک نظر آتی ہے کہ وہ نہ صرف اپنے گھریلو کام- کاج بذات خود کرنے میں فرحت واِنبساط محسوس کرتے تھے بلکہ دوسرں کے کام آنے میں بھی

اُنھیں یک گونہ فرحت وسرور کا احساس ہوتا تھا۔ وہ اکثر آتے جاتے اپنے آس- پاس والوں سے پوچھتے کہ کسی کو کچھ منگانا تو نہیں ہے؟ یہاں تک کہ کبھی کبھی تو پڑوس کے کچرے بھی خوشی خوشی باہر پھینک آتے تھے۔ یہاں تک کہ نماز کے لیے جاتے ہوئے بھی وہ کچرا وغیرہ مانگ کر لے جاتے تھے۔ اور اِسی بس پر نہیں تھا بلکہ خانہ داری کے انتظام وانصرام میں اُن کی مشق ومہارت کا یہ عالم تھا کہ ازراہِ محبت اپنے ہم پیشہ ضمیر جعفری کے بعض گھریلو اِنتظامی اُمور بھی اُنھوں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔

یہی وہ انسانی جذبہ تھا جس نے اعظم کریوی کو کام، کام اورصرف کام میں مصروف کررکھا تھا، ممکن ہے کہ وہ اس میں یقین رکھتے ہوں کہ ’’زمین کے اوپر کام اور زمین کے نیچے آرام‘‘۔ یہ گمان اس طور پر بھی یقین میں بدل جاتا ہے کہ اُنھوں نے جو بھی کام کیا وہ نہایت انہماک اورلگن کے ساتھ کیا، چاہے وہ گھریلو اُمور ہوں، چاہے انسانی جذبے کے تحت کوئی کام، یا پھر دفتری امور ہوں۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی تو دفتر کا وقت ختم ہوجاتا پھر بھی وہ دفتری کاموں میں مشغول رہتے اور بقایا کاموں کو نمٹاتے رہتے۔ یعنی دفتر کا وقت ختم ہو چکا ہوتا اورحفیظ صاحب آوازیں دے رہے ہوتے کہ ڈاکٹر صاحب آیئے! دن بھر کی محنت کے بعد اَب کچھ گپ شپ ہوجائے مگر وہ ہیں کہ اب نئے سرے سے دفتر کھول کر بیٹھ گئے ہیں۔ بڑی سنجیدگی سے جواب دیتے: مرشد! مجھے ابھی معذور ہی سمجھئے، بہت کام بقایا پڑا ہے۔ آپ افسر سہی، محکمہ تو مجھی کو چلانا ہے۔ کام نہ ہوتا تو پیدا بھی کرلیتے، حفیظ صاحب دفتری ڈرافٹوں میں شعر کی جامعیت کے قائل تھے اورڈاکٹر صاحب افسانوی پھیلاؤ کے، اُن کی کوشش ہوتی کہ ڈرافٹ مرزا غالب کی غزل ہو، اِن کی کوشش ہوتی کہ ڈرافٹ میں تمہید، پلاٹ، مرکزی خیال، نقطۂ عروج سب کچھ ہو۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ کام پیدا ہوتا رہتا۔ ایک دن آخر وہی ہوا جو ہونا تھا کہ اعظم کریوی کی صحت بگڑنے لگی، کیوں کہ قوت برداشت سے زیادہ کام کا اثر صحت پر تو پڑنا لازمی تھا، لہٰذا وہ چوطرفہ مسائل ومشکلات، مثلاً ضعف ونقاہت، کثرت کار، مالی پریشانی اورسیاسی افراتفری کے شکار ہوئے بغیر نہ رہ سکے، لیکن ایسے عالم میں بھی انھوں

نے خود کو قابو میں رکھا اور حالات کی سنگینی کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کے بجائے جہد مسلسل اور عمل پیہم کو اَپنا شعار بنائے رکھا۔ حالاں کہ اخیر سال میں صحت کمزور، آمدنی قلیل، تین چار کنبوں کی کفالت کے باعث اعظم کا رنگ مرنے سے پیشتر ہی زرد ہو چکا تھا۔ نہ جانے وہ زندگی کے کتنے محاذوں پر لڑ رَہے تھے مگر زندگی کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر ہرگز آمادہ نہ تھے۔ جس جس طرح کی مادّی و ذہنی پریشانیوں میں گھرے ہوئے اُنھیں دیکھا گیا، اگر کوئی اور ہوتا تو مدتوں پہلے گھٹنے ٹیک دیتا مگر وہ برابر لڑتے جا رہے تھے۔ اوپر سے ہجرت اور مہاجر ہونے کے باعث اُن کی پریشانیوں میں اور اِضافہ ہوتا چلا گیا۔ اُس پر ملازمت سے سبکدوشی نے رہی سہی اُن کی کمر بھی توڑ دی اور وہ اَن چاہا مشکلات و مصائب میں گھرتے چلے گئے۔

بحیثیت انسان نواز: اِس سے قطع نظر کہ اعظم کُریوی بچپن میں ضدی اور غصہ ور طبیعت کے مالک تھے، جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی اُن کے اندر انسان دوستی اور احباب نوازی کا جذبہ بڑھتا گیا۔ چناں چہ جو کبھی بچوں کے شور و غوغا سے گھبرایا کرتے تھے اور کبھی کبھی بچوں کو اُن کی شرارتوں پر اُنھیں طمانچے بھی مار دیا کرتے تھے، ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ اُنھیں پوتوں اور نواسوں کے ساتھ وقت گزارنے لگے۔ پھر اُن کی یہ محبتیں اور شفقتیں صرف اپنوں تک ہی محدود نہیں رہیں بلکہ زندگی میں جو کوئی بھی ایک بار اُن سے مل لیا، یا اتفاقاً کسی سے کبھی کوئی ملاقات ہو گئی تو بھی اُس کو ہمیشہ یاد رکھتے اور جب دوبارہ اُس سے ملاقات ہوتی تو اُس کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتے۔ شاہد احمد دہلوی مدیر ماہنامہ ''ساقی'' کراچی کے بقول: اتفاق سے اُن سے پہلی ملاقات میرٹھ کے نوچندی میں ہوئی۔ تعارف ہوتے ہی گلے سے لگایا کہ نہ جانے کب کے ترسے پھڑکے ہوئے تھے۔ پھر اُس پر سخت مصر کہ نہیں، ابھی میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ میرٹھ میں کہیں اور ٹھہرے ہی کیوں؟ بمشکل تمام اُنھیں اس پر رضامند کیا کہ کل دوپہر کو قافلہ آپ کے یہاں آئے گا اور خوب جی بھر کے باتیں ہوں گی۔ اگلے دن ہم ان کے گھر گئے تو ڈاکٹر صاحب خاطر و مدارات میں بچھے جاتے تھے اور بار بار شکوہ کرتے تھے کہ میرٹھ آپ آئیں اور کہیں اور ٹھہر جائیں؟ کئی گھنٹے اُن سے باتیں

ہوتی رہیں۔شام کی گاڑی سے ہمیں دہلی جانا تھا۔جب ہم چلنے لگےتو ڈاکٹر صاحب رنجیدہ ہو گئے اور اُس وقت تک ہمارا ساتھ نہ چھوڑا جب تک ہمارے تانگے روانہ نہیں ہو گئے۔ لوگوں سے راہ ورسم اور شناسائی پیدا کرنے میں بھی اعظم بڑے تیز واقع ہوئے تھے۔راہ چلتے چلتے،بس یا ٹرام میں بیٹھے بیٹھے،اجنبی لوگوں سے اچھی خاصی جان پہچان بنا لیتے تھے۔ ٹیلیفون کرتے ہوئے کوئی غلط نمبر مل جاتا تو اکثر وبیشتر اس اتفاقیہ تقریب کو باقاعدہ تعارفی تقریب کے قالب میں ڈھال دیتے تھے اور کمال تو یہ تھا کہ ان لوگوں کو یاد بھی رکھتے تھے۔ البتہ! گہری دوستیاں قائم کرنے کی طاقت اُن میں نہ تھی لیکن جس کسی سے بھی اخلاص کا رشتہ ایک بار قائم ہو جاتا تو وہ دیدہ ودل اس کے سامنے فرش راہ کر دیتے تھے۔ حالاں کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اعظم کریوی سخت مالی بحران کا شکار تھے پھر بھی اُنھوں نے احباب نوازی سے منھ نہیں موڑا۔ پُرانے تعلقات کے رکھ رکھاؤ،احترام اور وضع داری میں اپنی معذوریوں، مجبوریوں کو یکسر بھول جاتے تھے۔ایک مرتبہ کراچی سے اپنی سائیکل پر سوار واپس آئے اور کہنے لگے: بھائی صاحب! کل شام کا کھانا ہمارے یہاں کھایئے گا۔خیرت تو ہے؟ میں نے تعجب سے پوچھا۔معلوم ہوا کہ ہندوستان کے ایک مشہور شاعر جو اِن دنوں کراچی آئے ہوئے تھے،اُنھیں کھانے پر مدعو کر آئے ہیں۔یہی نہیں بلکہ اُن کے ساتھ 15-20 دیگر اصحاب بھی، جو اُس وقت جناب شاعر کی خاطر داری میں مصروف تھے۔فرمایا: مجھے معلوم ہے کہ اس ایک دعوت کا لایا ہوا قحط مہینوں اب میرے گھر میں رہے گا مگر بھائی صاحب! مدت کے بعد اُن سے ملاقات ہوئی ہے۔ ملنے چلا گیا تو اَب کیا کرتا... اُن سے کیا کہتا؟ گویا اعظم کریوی کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی آدمی اُن کے قریب رہے اور اُن کے اخلاص، اُن کے انکسار، اُن کی ہمدردی اور تعلقات میں اُن کی گرمجوشی سے متاثر نہ ہو پائے۔ وہ جس کسی کے قریب جانا چاہتے تو اِنتہائی کشادہ دلی سے اپنے آپ کو اُس کے سپرد کر دیتے۔اُن کی شخصیت شہد اور موم کی بنی ہوئی تھی۔ میں نے کبھی ایک سنگریزے کی کسک بھی اُن میں محسوس نہیں کی۔مزاج ایسا پایا تھا کہ اس مزاج کا آدمی جہاں کہیں بھی مل جائے تو اُسے اٹھا کر دفتر میں

رکھ لینا چاہیے، مثلاً: ملائم، متحمل اور معاملہ فہم۔ اِن تمام باتوں کے پیچھے اُن کی غیر معمولی ذہانت کارفرما تھی۔ وہ جب بھی کوئی رائے دیتے تو بڑے سلیقے سے دیتے۔ ضمیر جعفری بتاتے ہیں کہ معاملات پر اپنی ایک رائے بھی رکھتے، موقع محل دیکھ کر اُس کا اظہار بھی ضرور کرتے، مگر سب کچھ اِس سلیقے کے ساتھ کہ گویا اپنی کوئی رائے ہی نہیں۔ کوشش یہ ہوتی کہ ڈائریکٹر صاحب (حفیظ جالندھری) اُن کی رائے خود اپنی رائے سمجھ کر اُس پر عمل کریں۔ وہ اپنے نقطہ نظر کو واشگاف الفاظ میں بیان نہیں کرتے تھے، بلکہ افسر کو گھیر گھار کر اُس تک لے آتے تھے۔ اپنے کام کی اہمیت، اس کی مقدار و معیار پر روشنی ڈالنے کا ملکہ اُن میں وافر انداز میں تھا۔

اعظم کُریوی کی انسان دوستی کے شاہد وہ خطوط بھی ہیں جو اُنھوں نے اپنے احباب اور متعلقین کو لکھے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اُن کے خطوط، مجموعہ کی شکل نہ پا سکے اور اگر کچھ شائع بھی ہوئے تو اُنھیں قابلِ اعتنا نہ سمجھا گیا۔ مختلف مواقع پر شاہد احمد دہلوی اور اعظم کُریوی کے مابین مراسلاتی تعلقات قائم رہے، چناں چہ وہ بیان کرتے ہیں کہ اُن (اعظم کریوی) کے خطوط سے بڑی محبت ٹپکتی تھی۔ انھوں نے وقتاً فوقتاً یوسف کمال ناروی کے نام بھی کئی خطوط لکھے جن سے اُن کی شخصیت پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر 23 ستمبر 1944ء کے اپنے ایک خط میں وہ لکھتے ہیں: والد صاحب، والدہ صاحبہ، محسن صاحب، مرشد، نورمرشد، ماسٹر صاحب، بڑے بابو کو سلام، بچوں کو پرخلوص دعائیں۔ 13 دسمبر 1944ء کو ایک دوسرے خط میں لکھا کہ میری بیگم آپ کو دعا کہتی ہیں۔ بچے سلام عرض کرتے ہیں۔ نمبر دار بحساب عمر بچوں کے نام سن لیجیے: افتخار احمد، زینت النساء، تہذیب النساء، نیر اعظم، نیر اعظم سب سے چھوٹے ہیں۔ قیصر و توصیف سلمہ کو بہت بہت دعائیں۔ ہاں! میں نے دریافت کیا تھا کہ والد صاحب کا جو تبادلہ کلکتہ ہو گیا تھا وہ منسوخ ہوا، یا نہیں؟ مگر آپ نے اب تک کوئی جواب نہیں دیا۔ میری طرف سے والدہ صاحبہ، والد صاحب، مرشد، محسن صاحب، نورجہاں، ماسٹر صاحب، بڑے بابو، ڈرائیور صاحب و جملہ پُرسانِ حال کو سلام۔ اِس طرح سے نام بنام سلام و دعائیں بھیجنا، یہاں تک کہ ڈرائیور کو بھی سلام، اعظم کُریوی کی

انسان دوستی کی واضح دلیل ہے۔

حب الوطنی: شاہد احمد دہلوی کے مطابق اعظم کُریوی نے عرصۂ دراز تک دیہات میں زندگی گزاری اور ڈاکٹر حامد کمال ناوری کا یہ کہنا کہ اعظم کُریوی زیادہ تر اپنے وطن سے باہر رَہے اور شہر میں اُن کا وقت زیادہ گزرا۔ اِن دونوں باتوں میں مطابقت تلاش کرنے کے بجائے یہاں یہ دیکھنا اہم ہے کہ اعظم کُریوی کو اپنے وطن اور گاؤں سے کس قدر محبت تھی اور اُنھیں علاقہ اور علاقہ کے باشندوں کا کس قدر خیال تھا؟ اب چاہے وہ دیہات میں زیادہ رہے ہوں یا شہر میں، بہرصورت اُنھیں اپنے وطن اور گاؤں سے حد درجہ محبت تھی۔ یہی وہ اصل وجہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے قلمی نام ''اعظم'' کے ساتھ اپنے گاؤں 'کُرئی' کی نسبت کے باعث 'کُریوی' لکھنا شروع کیا۔ اِس سے تعلق ایک مرتبہ شاعر نوح ناروی نے اعظم کریوی سے دریافت کیا: ''اعظم! اپنے نام کے ساتھ ''کُریوی'' کیوں لکھتے ہو؟ تو اُنھوں نے جواب دیا: اُستاذ! میں چاہتا ہوں کہ میرا گاؤں پوری دنیا میں مشہور ہو، اور ایک دن دیکھئے گا کہ میرے گاؤں کا نام پوری دنیا میں ضرور مشہور ہوگا۔'

اور آج اُن کا یہ کہنا سچ ثابت ہو رہا ہے کہ آج ایک معمولی گاؤں ''کرئی'' دنیا میں معروف ہے۔ نیز اِس میں دو رائے نہیں کہ اعظم کُریوی تعلیم و تعلّم یا پھر ملازمت کے سلسلے میں اپنے وطن سے باہر رہے، مگر وہ ہمہ دم اپنی وطن دوستی کا ثبوت فراہم کرتے رہے۔ مثلاً جب بھی وہ کچھ تحریر کرتے تو اُس تحریر کے آخر میں اپنے گاؤں کا نام ضرور لکھتے۔ چناں چہ جب ''ہندی شاعری'' کا دیباچہ لکھا تو اُس کے خاتمے میں اپنا نام اور اپنے گاؤں کا نام اِس نہج پر لکھا: ''اعظم کریوی، کورئی، الہ آباد، 25 اگست 1928ء''۔

جبکہ اُس وقت اعظم کریوی کی پوسٹنگ ''کوئٹہ'' میں تھی، لیکن پھر بھی اُنھوں نے اپنے نام کے ساتھ ''کوئٹہ'' کی جگہ اپنے چھوٹے سے گاؤں ''کُرئی'' کا نام لکھا جو اُن کے آبائی وطن سے بے لوث محبت اور مثالی لگاؤ کی دلیل ہے۔ اسی طرح اپنے افسانہ 'پریم کی لیلا' میں اپنے وطن کا ذکر اِس طور پر کیا ہے کہ گویا اُن کا گاؤں نہایت ہی مشہور و معروف

گاؤں میں سے ایک ہو، مثلاً: ’کورئی گھاٹ کے پاس گنگا جی کے کنارے الہ آباد کے ضلع میں ایک گاؤں رام چورا ہے۔‘ یہاں ’کورئی گھاٹ‘ کے ذکر کی کوئی ضرورت نہیں تھی، کیوں کہ ’’کورئی گھاٹ‘‘ کے بالمقابل ’’گنگا جی‘‘، ’’الہ آباد‘‘ اور ’’رام چورا‘‘ زیادہ مشہور تھا۔ بلکہ صرف اتنا کہہ دینا بھی کافی تھا کہ ’’گنگا جی کے کنارے الہ آباد ضلع میں ایک گاؤں رام چورا ہے۔‘‘ لیکن اعظم کریوی نے اپنے غیر معروف گاؤں کو بھی اِس طرح پیش کیا کہ جیسے وہ کوئی مشہورِ عالم گاؤں ہو۔ یہ بھی اپنے گاؤں اور وطن سے اُن کی محبت کی واضح دلیل ہے۔

ملازمت کے سلسلے میں اعظم کریوی ملک کے مختلف گوشوں میں رہے، لیکن جہاں کہیں بھی رہے وطن اور گاؤں کی یاد اُنھیں ستاتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ جب جہاں اُنھیں اظہار کا موقع ملا اپنے گاؤں سے محبت اور وطن دوستی کا مظاہرہ کر بیٹھے۔ خواہ نثر کے توسط سے ہو یا نظم کی توسط سے، مثلاً:

اعظم تمام عمر غریب الوطن رہا
خانہ بدوش ہوں کہیں دنیا میں گھر نہیں

وطن میں عید نہ منا پانے پر اپنے غم کا اظہار کچھ اس انداز سے کرتے ہیں:

ہم تو ہیں پردیش میں اعظم منائیں عید کیا
دید کے قابل مگر اہل وطن کی عید ہے

اعظم کُریوی کے کئی خطوط بھی ایسے ہیں جن سے اُن کی وطن دوستی ظاہر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر 13 دسمبر 1944ء کو اُنھوں نے ایک خط محمد یوسف کمال ناروی کے نام لکھا۔ اُس میں وہ لکھتے ہیں کہ سخت انتظار کے بعد نارہ شریف کا چلا ہوا خط مجھے یہاں ملا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ اب تک وطن کی فضاؤں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔ چناں چہ میں بغرض یاد دِہانی خط لکھنے ہی والا تھا کہ آپ کا گرامی نامہ مل گیا۔ بہت خوشی ہوئی۔

پھر 20 اگست 1946ء کو اَنبالہ چھاؤنی سے محمد یوسف کمال ناروی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ آپ کا 17 اگست کا کارڈ ملا۔ آخر آپ ہگلی سے جو پھسلے لب گنگا پہنچے۔ وطن

پہنچ ہی گئے۔ اِس سے بڑھ کر کیا خوشی ہوسکتی ہے۔ والد صاحب بھی فیض آباد آ گئے۔ یہ سب اللہ کا فضل و کرم ہے۔ بنڈیل ہزار رُومانی مقام ہومگر ''حب وطن از ملک سلیماں خوش تر''۔ اب آپ الہ آباد آ گئے ہیں تو آپ سے ان شاء اللہ جلد جلد ملاقات ہوتی رہے گی۔ یہاں کا موسم خوش گوار ہے، میرے الہ آباد کا کیا حال ہے؟

خلاصہ یہ کہ اپنے وطن سے ایسی محبت کون کرسکتا ہے۔ اعظم کریوی نے یہ نہیں لکھا کہ ''الہ آباد'' کا کیا حال ہے؟ بلکہ یہ لکھا ہے کہ ''میرے الہ آباد'' کا کیا حال ہے؟ الہ آباد کے ساتھ ''میرے'' کا لفظ وجدانی کیفیت کا مظہر ہے۔ لیکن یہ کون جانتا تھا کہ ایک دن وہ بھی آئے گا کہ اعظم کریوی نہ صرف اپنے وطن سے دور ہو جائیں گے بلکہ اپنے گاؤں اور وطن کی گود میں سونے کے بجائے دیارِ غیر میں ایک مہاجر کی طرح دنیا سے رخصت ہوں گے۔

تحریک آزادی: ایک غیور قوم اور سچے ہندوستانی کی طرح اعظم کُریوی بھی آزادی کے حامی اور دلدادہ تھے۔ انگریز اُنھیں ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ملازمت میں جو ترقی اُنھیں ملنی چاہیے تھی وہ نہ مل سکی، کیوں کہ اعظم کُریوی دفتر میں بھی انگریزوں اور اُن کے بہی خواہوں کے آداب و تعظیم اُن کی مرضی کے مطابق نہیں کر پاتے تھے، اور کبھی کبھی نوبت تو اِس حد تک پہنچ جاتی تھی کہ اعظم کُریوی انگریز افسروں سے بھڑ بھی جاتے تھے۔ سرکاری ملازم ہونے کے باوجود اعظم کُریوی خفیہ طور پر قومی اور ملی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ خود بھی ولایتی سامان سے احتراز کرتے اور دوسروں کو بھی اِس بات کی ترغیب دیتے کہ وہ لوگ بدیسی سامان کے بجائے دیسی سامان استعمال کریں اور بدیسی دکانوں کے بجائے دیسی دکانوں سے چیزیں خریدیں۔ انگریز بیزاری اور آزادی کی خواہش صرف اُن کے قلب کے اندر ہی نہیں تھی بلکہ یہ سب باتیں اُن کی تحریروں اور افسانوں میں بھی باقاعدگی سے نظر آتی ہیں۔ اِس تعلق سے اُن کے افسانے ''انقلاب''، ''کرنی کا پھل'' وغیرہ بطور مثال پیش کیے جاسکتے ہیں۔

ڈاکٹر اعظم کُریوی ویسے تو مطلق انگریز سے نالاں تھے، لیکن بالخصوص اُن کی بدسلوکی اور

ہندوستانیوں کے ساتھ ان کا غیر انسانی رویہ اُنھیں بالکل پسند نہیں تھا۔ ان کے متعدد افسانے ایسے ہیں جن میں اُنھوں نے انگریزوں کی بدسلوکیوں اور اُن کی غیر انسانی حرکتوں کو عوام الناس کے سامنے واضح طور پر پیش کیا ہے۔ چناں چہ اپنے ایک افسانے میں وہ لکھتے ہیں کہ ""سرکاری ملازم ہو کر بھی وہ پوشیدہ طور سے ملی اور قومی کاموں میں بہت حصہ لیتے۔ ولایتی دکانوں کے بجائے وہ ہمیشہ دیسی سے سودا سلف خرید تے تھے۔ ونے کرشن ایسے مشہور لیڈر کا درشن کرنے کے لیے ڈاکٹر صاحب آگے بڑھے"۔

انگریزوں کا جو گھٹیا رویہ ہندوستانیوں کے ساتھ جاری تھا اُس پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ "کلکتہ جانے والی گاڑی پلیٹ فارم کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی اور وِنے کرشن دوسرے درجے میں بیٹھنے کے لیے بڑھے، جیسے ہی وہ کھڑکی کھول کر کمرے میں داخل ہونے لگے اندر بیٹھے ایک یورپین صاحب بہادر نے ڈانٹ کر کہا: "یو، کالا آدمی کی گاڑی نہیں۔"

وِنے کرشن نے کہا: "کیوں، میرا روپیہ بھی کالا ہے؟ میرے پاس سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ ہے۔"

ایک تو حکم نہ ماننا اور دوسرے گستاخانہ جواب ایک کالے آدمی کی طرف سے سفید چمڑے والا نہ سہن کر سکا۔ اُٹھا اور دھوتی قمیص ریشمی چادر اوڑھنے والے سوراجی لیڈر کو پلیٹ فارم پر دھکیل دیا، اور اِس کے ری ایکشن میں اسٹیشن پر اُس انگریز کی جو درگت بنی اُس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں: جو والنٹیئر اور قوم پرست لوگ وِنے کرشن کو پہنچانے آئے تھے وہ سب اُن کی بے عزتی ہوتے دیکھ کر آپے سے باہر ہوگئے۔ والنٹیئر وں نے وندے ماترم کا نعرہ لگایا اور دو تین آدمی کمرے میں گھس کر صاحب بہادر کو باہر کھینچ لائے اور چاروں طرف سے بے بھاؤ کے پڑنے لگے۔ شور وغل سن کر اِس طرف گارڈ آرہا تھا وہ صاحب بہادر کی گت دیکھ کر چپ چاپ بریک وان میں گھس گیا، بڑی مشکل سے سمجھدار لوگوں نے صاحب بہادر کو بچالیا۔"

یہ تمام مناظر دراصل اعظم کریوی کی آزادی کی حمایت اور انگریز سے نفرت کو بیان کرتے ہیں۔ مذکورہ افسانے میں اعظم کریوی نے اپنے دلی جذبات اور چشم دید حال پیش

کیاہے کہ کس طرح قومی وملی پروگرام میں وہ چھپ چھپا کر حصہ لیتے، مجاہدین آزادی سے ملاقات کرتے (جیسا کہ ونے کرشن سے ملاقات کی) اور اِس طرح ملازمت میں رہتے ہوئے ملکی وملی مفاد کے لیے سرگرم عمل رہے۔

مصادر وماخذ:

ماہنامہ اخبار اعظم، کراچی، اعظم کریوی نمبر، جون وجولائی، 1990ء، ص:62

اردو افسانے کی تشکیلی روایت میں اعظم کریوی کا حصہ، باب:2، فصل:4 (قلمی نسخہ)

ماہنامہ اخبار اعظم، اعظم نمبر، جون-جولائی، 1990ء، ص:62

میرا پسندیدہ افسانہ، ص:105، مصنفہ بشیر ہندی بحوالہ اخبار اعظم، کراچی

ماہنامہ اخبار اعظم، اعظم نمبر، جون-جولائی، 1990ء، ص:62

میرا پسندیدہ افسانہ، ص:106، مصنفہ بشیر ہندی بحوالہ اخبار اعظم، کراچی، 1990ء

اُردو افسانے کی تشکیلی روایت میں اعظم کریوی کا حصہ، باب:2، فصل:4 (قلمی نسخہ)

ماہنامہ اخبار اعظم، اعظم کریوی نمبر، جون-جولائی، 1990ء

اُردو افسانے کی تشکیلی روایت میں اعظم کریوی کا حصہ، باب:2، فصل:4 (قلمی نسخہ)

ماہنامہ نیرنگ خیال، سالنامہ نمبر، دسمبر 1934ء، ص:30

اُردو افسانے کی تشکیلی روایت میں اعظم کریوی کا حصہ، باب:2، فصل:4 (قلمی نسخہ)

ماہنامہ ساقی کراچی، نومبر، 1955ء، ص:32-31

اردو افسانے کی تشکیلی روایت میں اعظم کریوی کا حصہ، باب:۲، فصل:۴ (قلمی نسخہ)

ماہنامہ ساقی کراچی، نومبر، ۱۹۵۵ء، ص:۳۱-۳۲

اردو افسانے کی تشکیلی روایت میں اعظم کریوی کا حصہ، باب:2، فصل:4 (قلمی نسخہ)

ماہنامہ ساقی کراچی، نومبر، 1955ء، ص:32

ماہنامہ ساقی کراچی، نومبر، 1955ء، ص:33

اردو افسانے کی تشکیلی روایت میں اعظم کریوی کا حصہ، باب:2، فصل:4 (قلمی نسخہ)

ماہنامہ ساقی کراچی، نومبر، 1955ء، ص: 32

حوالہ سابق، ص: 34

حوالہ سابق، ص: 12

حوالہ سابق، ص: 34

حوالہ سابق، ص: 33، حوالہ سابق، ص: 12

اردو افسانے کی تشکیلی روایت میں اعظم کریوی کا حصہ، باب: 2، فصل: 4 (قلمی نسخہ)

ماہنامہ اخبار اعظم، کراچی، جون- جولائی، 1990ء، ص: 26

روزنامہ زمیندار، لاہور، 27 جون 1955ء

اردو افسانے کی تشکیلی روایت میں ڈاکٹر اعظم کریوی کا حصہ، ص: 321-320

افسانہ ''کرنی کا پھل''

❖❖❖

Dr. Jahangir Hasan
Shah Safi Academy,
Jamia Arfia Syed Sarawan
Distt. Koshambi (UP) 212213
Mob. 9910865854

تخلیق کاروں سے گزارش

- ❖ سہ ماہی ''اکادمی'' کے لئے معیاری نگارشات ہی ارسال کریں۔ ہر تخلیق پر غیر مطبوعہ کی تصدیق ہونا لازمی ہے۔ ساتھ ہی مکمل ایڈریس، موبائل نمبر بھیجیں۔
- ❖ ای۔میل سے بھیجی ہوئی نگارشات کا پروف اچھی طرح پڑھ لیں، اِن پیج فائل کے ساتھ پی ڈی ایف بھی بھیجیں۔
- ❖ تخلیقات کے ساتھ بینک اکاؤنٹ میں درج نام، بینک کا نام، شاخ کا نام، آئی۔ایف۔ ایس۔سی نمبر انگریزی میں لکھ کر بھیجنا ضروری ہے، پاس بک کی فوٹو کاپی یا کینسل چیک بھی منسلک کرنے کی زحمت کریں۔

Vol.-22 Issue No. 4 April - June 2025
उत्तर प्रदेश उर्दू अकादमी पत्रिका
اُترپردیش اردو اکادمی مجلہ

اُترپردیش اُردو اکادمی کی نئی کتابیں

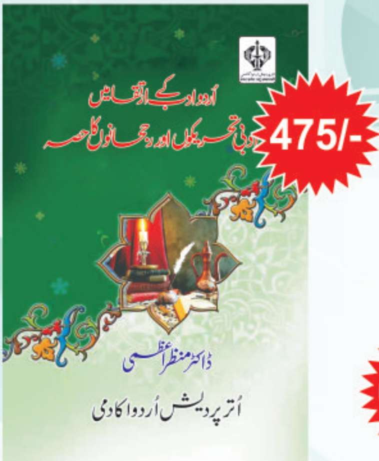

رابطہ کریں
سکریٹری، اترپردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ گومتی نگر، لکھنؤ-226010
سیل ڈپو : 0522-4022924